Join eBooks Telegram

۴۸۶

سوغات

سہ ماہی

چوتھا شمارہ

مدیر

محمود ایاز

فون نمبر 71986

پتہ: ۲۷، کلائن روڈ بنگلور ۵

قیمت ۲ روپے

مطبوعہ برقی پاسبان پریس بنگلور ۱

الف

Join eBooks Telegram

سوغات

چوتھا شمارہ

مقام اشاعت: ۲۷، کلاٹن روڈ بنگلور ۵

طباعت: برقی پاسبان پریس بنگلور ۱

قیمت: فی پرچہ ۷۵(۲) روپے

(سالانہ آٹھ روپے)

پاکستان میں

"سوغات" کا سالانہ چندہ ۱۵ روپے (مع رجسٹری خرچ)
اس پتے پر روانہ کیا جاسکتا ہے

غلام حسین صاحب اسوسی ایٹڈ پرنٹرس
S.I.TE. B.29.
منگھوپیر روڈ کراچی

نوٹ: خریداروں کو پرچہ بک پوسٹ کے ذریعہ روانہ کیا جاتا ہے، جو حضرات سالانہ چندے کے ساتھ رجسٹری کا بھی خرچ روانہ کریں گے ان کو پرچہ بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ بھیجا جائے گا، بصورت دیگر ادارہ پرچہ کی عدم وصولی کی ذمہ داری نہیں لے سکتا

Join eBooks Telegram

فہرست

نقش اول صفحہ ۱ تا ۸

مضامین

افسانے

غزلیں

نظمیں

Join eBooks Telegram

Join eBooks Telegram

ہر انسانی معاشرہ ذہنی اور فکری اعتبار سے دو قسم کے افراد پر مشتمل ہوتا ہے، پہلی قسم ان افراد کی ہوتی
جن کا اپنے دور، اپنے معاشرے اور حیات و کائنات کے ان تمام مسائل سے کوئی شعوری تعلق نہیں ہوتا
کی ذاتی زندگی کی حیاتیاتی اور سماجی ضروریات کے دائرے سے باہر ہوں، ایسے افراد کی ہر زمانے
ہر معاشرے میں اکثریت ہوتی ہے، ان لوگوں کیلئے روزی کمانا، بیوی بچوں کی پرورش کرنا اور بہت
معنوں میں ایک آسودہ زندگی گزار لینا کافی ہوتا ہے، یہ لوگ اپنے وراثتی اعتقادات کے حصار
استعجاب، تجسس، تفکر، تشکیک اور دریافت کی جملہ "بلاؤں" سے محفوظ و مامون رہتے ہیں ان کے
س ذہن ہوتا ہے فکر نہیں ہوتی

ان کے برعکس دوسری قسم کے افراد حیات و کائنات سے اپنا تعلق ذاتی زندگی کی ضروریات کے دائرے
باہر استوار کرتے ہیں، یہ لوگ معاشرے کی وہ اقلیت ہوتے ہیں جو فلاسفروں، مفکروں سائنس
نوں، ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں پر مشتمل ہوتی ہے

انسانی زندگی کی غایت اور مآل پر دماغ سوزی کرنے والے فلاسفر اور مفکر اشیا کی ماہیت دریافت
رنے اور فطرت کی تسخیر کی فکر میں سرگرداں رہنے والے سائنسدان ـــــ "جو ہے" اور "جو ہونا چاہیئے"
کے تضاد سے پیدا ہونے والی انسانی جدوجہد کی شکست و فتح، غم و نشاط اور کرب و حسن کو الفاظ میں، رنگوں
میں، پتھر اور دھات میں، آواز کے زیر و بم میں مجسم کرنے والے شاعر، مصور، مجسمہ ساز اور موسیقار
سب لوگ اسالیبِ اظہار کی مختلف سطحوں پر فکر و عمل کے الگ الگ دائروں میں مصروفِ کار رہتے ہیں
لیکن ہر سطح پر ان کے احساس و اظہار اور فکر و عمل کی بنیاد انسانی زندگی اور کائنات سے ایک غیر ذاتی
شعوری تعلق پر ہوتی ہے، حیات و کائنات سے یہی غیر ذاتی اور شعوری تعلق انھیں اپنے معاشر

Join eBooks Telegram

کی اکثریت سے جدا اور ممیز کرتا ہے، حیات و کائنات سے یہ "غیر ذاتی" اور شعوری تعلق دراصل ا
یہ ذوقِ جمال" کے وجود سے باخبر ہونے اور اس کے مصرف و اظہار کی تلاش میں سرگرم ہونے کا
ہے، جس کی طرف اقبال نے اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

نماساہ کو بخشا گیا ہے ذوقِ جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے

یہ "ذوقِ جمال" انسانیت کی سرشت میں ازل سے ودیعت کردہ ہے لیکن اس کا شعور او
مقصود و مصرف تلاش کرنے کی لگن ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی اس شعور اور لگن کے ساتھ ہ
انسان اور حیات و کائنات کے درمیان جو رشتہ قائم ہوتا ہے اس کیلئے میں نے شعوری" اور غ
کی اصطلاحات استعمال کی ہیں

یہ "شعوری اور غیر ذاتی تعلق" یا "ذوقِ جمال" ہزاروں روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ ا
ہیبتناک کائنات کی وسعت میں پھیلے ہوئے اسرار کو سمجھنے کی تڑپ، زمین پر انسان کے وجود کی
اور مآل کو جاننے کی لگن، زیادہ سے زیادہ انسانوں کیلئے زندگی کو بہتر زیادہ آرام دہ اور خوش
بنانے کی آرزو، انفرادی دکھ سکھ میں انسانی زندگی کے غم و نشاط اور کرب و مسرت کا آفاقی اح
یہ سب اسی ذوقِ جمال کے مظاہر ہیں

زندگی اور کائنات سے یہ "شعوری" اور "غیر ذاتی" تعلق معاشرہ کی اکثریت اور اقلیت
کے درمیان حد فاصل قائم کرتا ہے اور انہی معنوں میں ادیب اور شاعر معاشرے کے دیگر افرا
الگ اور مختلف ہوتے ہیں

ادیبوں اور شاعروں کو خواب دیکھنے والے کہا گیا ہے کیونکہ ان کا مطمح نظر ہمیشہ "جو ہے
بجائے جو ہونا چاہیئے" ہوتا ہے۔ آندرے ژید نے ایکبار کہا تھا کہ ہر بڑا فنکار
NON - CONFORMIST ہوتا ہے. کیونکہ اپنے دور اور معاشرہ سے ادیب و شاعر کا رشتہ و ا
حقیقت کی بنیاد پر نہیں بلکہ تخیلی حقیقت کے فرق کا شعور وہ واحد پل ہے جو فنکار کا اپنے دور سے
تعلق قائم کرتا ہے اسی لئے اپنے دور کی زندگی سے فنکار کا ہر تعلق ہمیشہ انحراف کی بنیاد پر قا
ہوتا ہے۔ انحراف کا یہ حق اگر فنکار سے چھین لیا جائے تو اس کا وجود باقی نہیں رہتا۔ فنکار ک

Join eBooks Telegram

اس حق کو مارکسی اہل فکر بھی تسلیم کرتے ہیں، مگر جزوی طور پر ـــ وہ فنکار کو اس بات کی آزادی ضرور دیتے ہیں کہ وہ معاشرہ سے یا دوسرے الفاظ میں "جو ہے" سے انحراف کرے لیکن "جو ہے" سے انحراف کے بعد "جو ہونا چاہیئے" کے انتخاب یا اظہار میں وہ فنکار کی آزادی کو مشروط کر دیتے ہیں اس طرح فنکار کی آزادی پر یہ حملہ دوسرے تمام حملوں سے اپنی نوعیت میں کلی مختلف اور منفرد تھا، فکر کو ایک مخصوص راستہ پر چلانے کیلئے خود آزادیٔ فکر پر اصرار کو جس طرح ذریعہ بنایا گیا وہ اتنا پر فریب تھا اور ہنگامی طور پر خارجی حالات نے بھی اس نقطۂ نظر کو اس طرح تقویت بخشی کہ فنکار کی آزادی کو مقدس ترین شئے سمجھنے والے لوگ بھی اپنی نیک نیتی کے باوجود اس نظریہ کے پیرو بن گئے لیکن یہ صورت حال زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکتی تھی اور بہت جلد اس غلط رویّہ کے خلاف آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں، ہمارے ہاں اردو ادب میں بھی گزشتہ چند سالوں سے یہ ردعمل طاقت پکڑ رہا ہے. فنکار کے انحراف اختیار کے حقوق اور آزادی کی زور و شور سے حمایت اور مدافعت کی جا رہی ہے، لیکن یہ رجحان صحیح اور جائز ہوتے ہوئے بھی ہمارے ہاں غلط سمت اختیار کرنے لگا ہے. مروجہ اقدار کی نفی یا ان سے انحراف کرنے کی آزادی پر اصرار کرنے والے اس حقیقت کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ اس آزادی کو ممکن اور موثر بنانے کیلئے چند پابندیوں کو قبول کر لینا ناگزیر ہے، یہ پابندیاں خارج سے عائد کی جانے والی پابندیوں سے مختلف ہوتی ہیں، خارج سے عائد کردہ پابندیوں سے بغاوت بھی کی جا سکتی ہے لیکن ان پابندیوں سے جو خود حصول آزادی کی ضروری شرائط ہوتی ہیں روگردانی کی جائے تو فنکار سے اس کا مقام اور منصب ہی چھن جاتا ہے ان شرائط میں سب سے بڑی شرط یہ ہے کہ اپنے دور کی واقعاتی حقیقتوں سے انحراف کرنے سے پہلے آدمی زندگی اور کائنات سے وہ غیر ذاتی تعلق قائم کرے جس کی اوپر وضاحت ہو چکی ہے اس تعلق کے بغیر جو انحراف کیا جائے گا وہ فنکارانہ انحراف نہیں بلکہ انارکی اور انتشار کہلایا جائے گا. فنکار کے انحراف کا حق حاصل کرنے کیلئے پہلے فنکار ہونا ضروری ہے، فنکار ہونے کا مطلب ایک مخصوص عرصہ ناگفتنی حالات کے زیر اثر چند غزلیں نظمیں یا افسانے لکھ لینا نہیں ہے، فنکار ہونے کی بنیادی اور اولین شرط یہ ہے کہ حیات و کائنات سے اپنے دور اور معاشرے سے اپنی ذات کے دائرے سے باہر بھی ایک رشتہ استوار کیا جائے، یہ رشتہ انحراف کی بنیاد پر قائم ہو یا وابستگی کی بنیاد پر اس کا اظہار فکر و فلسفہ کی سطح پر کیا جائے یا شعر و ادب کی سطح پر، یہ سب بعد کی باتیں ہیں. یہ چیزیں فنکار کے دائرۂ کار کا تعین کر سکتی ہیں کوئی اہم فرق نہیں پیدا کرتیں، لیکن اگر پہلی

Join eBooks Telegram

پہلی اور بنیادی شرط پوری نہیں ہو رہی تو پھر آپ سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر فنکار نہیں کہلا سکتے۔ فنکار سے خلوص سچی لگن اور ذمہ داری کے احساس کے مطالبات کرنے کی ضرورت اسی وقت محسوس ہوتی ہے جب فنکار فنکار ہونے کی بنیادی شرط کو پورا کئے بغیر فنکار بن بیٹھتے ہیں۔ ورنہ حیات و کائنات سے جس غیر ذاتی اور شعوری تعلق پر ہی اصرار کر رہا ہوں وہ ایک بے لوث لگن خلوص اور احساس ذمہ داری کے بغیر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ کائنات میں اپنا مقام متعین کرنے کی کوشش اور زندگی سے اپنا رشتہ پہچاننے کی تگ و دو کے بعد ہی حیات و کائنات سے آدمی کا تعلق شعوری بنتا ہے اور یہ شعوری تعلق قائم کرنے کیلئے فکر و احساس کے جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اس کے بعد فنکار سے احساس ذمہ داری کے کسی مزید مطالبہ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی

اس تعلق کے بعد فنکار کا ہر انحراف ایک تعمیری عمل بن جاتا ہے، کیونکہ جس تخیلی حقیقت کی بنیاد پر وہ اپنے دور اور معاشرے کی واقعاتی حقیقتوں کی نفی کرتا ہے وہ تخیلی حقیقت دراصل ان اقدار سے ترکیب پاتی ہے جنکی غیر موجودگی کی بنا پر وہ اپنے دور سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ ایسے معاشرے میں جہاں تعلقات کا قیام زر، زمین اور نسل کی بنیادوں پر ہو جہاں انسانی تجربوں کو آپس میں مربوط اور منسلک کرنے والی ہر کڑی شکست ہو چکی ہو وہاں ہر فنکار کو لازماً اپنے دور اور نظام حیات کی نفی کرنی پڑتی ہے لیکن یہ نفی اور انحراف اپنے دور سے یا زندگی سے فرار نہیں ہوتا بلکہ اس انحراف کی بنیاد پر اپنے دور سے اس کا رشتہ قائم ہوتا وہ انسانی اقدار جو اس کے معاشرے میں ناپید ہو چکی ہیں ان انسانی اقدار کے تصور سے فنکار کی تخیلی حقیقت کی تشکیل ہوتی ہے اس تخیلی حقیقت کو واقعاتی حقیقت میں بدلنے کیلئے وہ اپنے فن کو ذریعہ بناتا ہے اس طرح فنی تخلیق ایک عظیم ذمہ داری، ایک پیغمبرانہ مہم اور ایک مقدس تلاش بن جاتی ہے

یہاں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہئے کہ یہ تخیلی حقیقت اپنی انتہائی تجریدی شکل میں بھی قائم بالذات یا زمینی رشتوں سے ماورا نہیں ہوتی، کیونکہ تخیلی حقیقت فنکار کو جن اقدار کی تلاش، بازیافت یا تخلیق کی طرف لیجاتی ہے ان اقدار کی معنویت انسانی زندگی کے تعلق ہی سے قائم اور متعین ہوتی ہے تخیلی حقیقت کا وجود ہی اس اعتراف پر منحصر ہے کہ زمین پر ہر انسانی قدر کے مٹ جانے کے بعد بھی انسان باقی رہتا ہے، صرف اس یقین کے سہارے فنکار کٹھن سے کٹھن تنہائی اور طویل سے طویل خود عائد کردہ جلاوطنی کی ساری اذیتوں کو قبول کر کے انسان کیلئے ایک نئے نظام اقدار کی تلاش میں یولی سس بنکر نکل پڑتا ہے اس سفر میں وہ انسانی آبادی سے پرے کتنے بھی دور دراز جزیروں میں کیوں نہ نکل جائے لیکن

ہم

Join eBooks Telegram

اس کی واپسی ہمیشہ انسانی زندگی کی جانب ہی ہوتی ہے کیونکہ یہی اس کے سفر کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور غایت و مقصود بھی

فنکار اگر اپنے دور کی سماجی اور اخلاقی پابندیوں سے سیاسی اور مذہبی عقائد سے بغاوت کرتا ہے یا بغاوت کی آزادی پر اصرار کرتا ہے تو اس لئے نہیں کہ وہ بے قید و بند حیوانی زندگی کا متمنی ہے بلکہ اس لئے کہ یہ پابندیاں انسانی مقاصد کے حصول میں ذریعہ بننے کی بجائے انسان کے استحصال کا آلۂ کار بنگئی ہیں جو اصول اور اقدار خود اپنے مقاصد کی شکست کا ذریعہ بن جائیں ان کی پابندیوں سے انحراف آزادی کیلئے نہیں بلکہ نئی پابندیوں کی تلاش کیلئے ہوتا ہے، مروجہ اقدار روایات اور اعتقادات کی تمام زنجیریں کو توڑنے کے بعد آزادی نہیں ملتی بلکہ ایک نئے ضابطۂ حیات کی دریافت اور زندگی میں ایک معنویت کی تلاش کی ذمہ داری کا وہ گراں بوجھ ملتا ہے جسے فرشتوں کے کندھے بھی برداشت نہیں کر سکتے

اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی نئی نسل "آزادی طلب کرتی ہے۔ اس آزادی کی ذمہ داریوں سے باخبر ہونا اور ان ذمہ داریوں کو سمجھنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھنا تو دور کی بات ہے، یہ لوگ اس لفظ کے مفہوم سے بھی ناآشنا ہیں

پہلے اس بات کی وضاحت ہونی چاہئے کہ یہ آزادی کس سے مانگی جارہی ہے؟ کس پابندی کیخلاف مانگی جارہی ہے اور اس آزادی کا مصرف کیا ہوگا؟ اس وقت ہم لوگ جس ملک اور معاشرے میں جی رہے ہیں وہاں ادیبوں اور فنکاروں پر کونسی پابندی عائد ہے۔ اس معاشرے کے نقائص، معاشی اور اقتصادی بدحالی، اخلاقی و روحانی اقدار کا انحطاط، یہ سب باتیں تسلیم لیکن ان کے خلاف آواز اٹھانے یا انھیں اپنے فن میں منعکس کرنے کی کس نے ممانعت کر رکھی ہے

مجھے یہ بات تسلیم کہ آج وقت اور فاصلے بڑی تیزی سے سکڑ رہے ہیں اور دنیا ایک اکائی میں تبدیل ہوتی جارہی ہے ہم اپنے ملک کی جغرافیائی حدود کے خول میں گھس کر رہ کر دوسرے ممالک کے حالات سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت دنیا کے چند حصوں میں فکر و فن اور احساس و اظہار پر پابندیاں عائد کی جارہی ہیں، ان کے خلاف آواز اٹھانا ہر صاحب ضمیر انسان کا فرض ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تو دیکھنا ضروری ہے کہ اس وقت ہمیں اس خطۂ ارض میں جسے ہم اپنا ملک کہتے ہیں، جو آزادیاں حاصل ہیں ان سے ہم کیا کام لے رہے ہیں۔

Join eBooks Telegram

پھر پھرا کر بات ترقی پسند تحریک پر آ کر رکتی ہے ایک دور میں اس تحریک نے جو آمریت چلا رکھی تھی اس کا رونا رویا جاتا ہے۔ یہ بجد مضحکہ خیز صورت حال ہے، جس وقت یہ آمریت زندہ اور برسر عمل تھی، دراصل مناسب ترین موقع تھا، آزادی فکر و اظہار کی مدافعت اور اصرار کا لیکن آج جب یہ تحریک فکر و فن پر احتساب قائم کرنیوالے ایک ادارہ کی حیثیت سے ختم ہو چکی ہے اس وقت ہمارے شاعر ادیب آزادی کے نعرے بلند کر رہے ہیں، حالانکہ حقیقت حال تو یہ ہے کہ جس زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی اس زمانے میں بھی اس تحریک کے احتساب کی نوعیت صرف یہ تھی کہ اس نے فکر و اظہار کے چند مخصوص معیار بنا رکھے تھے اور اس معیار پر پورا اترنے والوں کو بانس پر چڑھایا جاتا تھا اور دوسروں کو گالیاں اور فتوے تقسیم ہوتے تھے، اسکے علاوہ تحریک کے پاس خوش قسمتی سے ایسے ذرائع تو تھے نہیں کہ وہ اسکے مسلک سے روگردانی کرنیوالوں کو سائبیریا بھیجے، چند رسالوں پر ان کی اجارہ داری تھی، روس اور چین کے دوروں کیلئے انتخاب مخصوص حواریین کا کیا جاتا تھا اور بس، یہ رویہ تو ہر سیاسی پارٹی کا ہوتا ہے، اس میں کوئی خاص بات تھی تو صرف یہ کہ ایک ادبی انجمن کو سیاسی پارٹی کی سطح پہ اتار دیا گیا تھا۔ اس تحریک کے ذمہ دار افراد کی یہ آمریت یا احتساب ایسی مطلق العنان ریاستی استبدادیت تو تھی نہیں کہ اسکے خلاف آواز اٹھانے والوں کو جان و مال کے زیاں کا خدشہ ہوتا، یہاں صرف کردار، ضمیر اور عزت نفس کے احساس کی ضرورت تھی لیکن بدقسمتی سے ہمارے بیشتر لکھنے والوں کے ہاں ان بنیادی چیزوں کا بھی فقدان تھا، ہاں چند ایک نفوس ایسے ضرور تھے جنھوں نے اپنے آپ کو سستی شہرت یا دیگر ترغیبات کے ہاتھوں بکنے نہیں دیا اور بعض ایک نے تحریک کے سیاسی مسلک سے اتفاق رکھتے ہوئے بھی اپنے ادبی منصب کو نظرانداز نہیں ہونے دیا، یہ لوگ اس "احتساب" کے زمانے میں بھی کام کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

آزادی فکر کے ساتھ ساتھ ایک اور بلند آہنگ نعرہ جو ان دنوں سنائی دے رہا ہے، "تشکیک" کا ہے۔ ہم لوگ آج جس دور میں زندہ ہیں وہ اقدار کی شکست و ریخت کا دور ہے، چیزیں اتنی تیزی سے بدل رہی ہیں کہ کسی شئے پر آنکھ جمنے کی مہلت نہیں مل رہی ہے، ہماری آنکھوں کے سامنے ایک مختصر سے عرصہ میں اتنے نظریات کا بطلان ہوا ہے، اتنے بت پاش پاش ہوئے، عقائد اور اقدار اس طرح تاراج ہوئے ہیں کہ یقیناً اس دور کو تاراج اور بے یقینی کا دور کہا جا سکتا ہے۔

Join eBooks Telegram

یہ صورت حال انسانی فکر و فلسفہ کی تاریخ میں مختلف سہی لیکن نئی نہیں ایسے بحرانی وقفے ہمیشہ آتے رہے ہیں اور ان وقفوں میں بے یقینی اور تشکیک کا ضرور فروغ ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ دور بے یقینی اور تاراج کا دور ہے تو ہماری فنی، ادبی تخلیقات میں اس کا اظہار کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ ہمارے ہاں ایسے فنکار کہاں ہیں جنھوں نے زندگی سے تشکیک اور بے یقینی کا زہر پی کر اپنے فن کو زندہ کر دیا ہو؟ ہمارے ہاں کوئی بودلیئر، کوئی جوائس کیوں نہیں پیدا ہو سکا؟ اس دور میں زندگی کے کسی خوش آئند مستقبل کا رجائی تصور نا ممکن سہی لیکن اس دور کی پیچیدہ اور بے یقین زندگی کا درد و کرب کسی فن پارے میں اپنی پوری شدت کے ساتھ کیوں نہیں ڈھل پاتا؟ حال کی بے بسی اور خوف ناامیدی کی فضا کو اپنے فن میں مجسم کر دینے والا کوئی کافکا کیوں نہیں پیدا ہوتا.

کیا تشکیک اور بے یقینی کا دور بڑے ادب کی تخلیق کیلئے زہر ہلاہل کا حکم رکھتا ہے؟

اس المیہ کی وجوہات ایک سے زیادہ ہوں گی لیکن سب سے بڑی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں فن اور فنکاری کے مطالبات اور ذمہ داریوں کو سنجیدگی سے سمجھنے اور قبول کرنے کی زحمت نہیں گوارا کی گئی، اپنی تن آسانی، تہی مائیگی اور زیادہ گوئی کے جواز کیلئے الفاظ اور نعروں کی پناہ تلاشی گئی — انھیں باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے سوغات کے گزشتہ شمارے میں کہا تھا۔

دو موجودہ نسل کے ادیبوں اور شاعروں کے ہاں حریت فکر اور آزادی اظہار کی جو طلب نظر آ رہی ہے وہ یقیناً ایک بہتر تبدیلی ہے لیکن ان کے پاس نہ اس آزادی کے صحیح مصرف کا کوئی شعور ہے اور نہ انھیں پراگندگی فکر اور آزادی فکر کا فرق معلوم ہے اسکی بنیادی وجہ علم اور غور و فکر کی کمی ہے اس ذہنی تہی مائیگی اور فکر کی محرومی کو چھپانے کیلئے اگر پچھلی نسل کے اکثر و بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے ایک تحریک کے دامن میں پناہ ڈھونڈی اور اگر وہ غور و فکر کی ساری ذمہ داریاں ایک غیر مرئی ہمہ دان، ہمہ گیر قوت کے ہاتھوں سونپ کر خود حساب کم و بیش سے سبکدوش ہو گئے تھے تو موجودہ نسل نے یہ پناہ گاہ ذہنی آزادی اور تشکیک کے نعروں میں ڈھونڈی ہے۔ پچھلی نسل والے تو خیر تھوڑی بہت دور تک تحریک کے دھاروں پر بہتے ہوئے نکل گئے لیکن موجودہ لوگ زیادہ دیر تک اپنی خود فریبیوں سے کام نہیں چلا سکیں گے۔ کاش انھیں کوئی بتاتا کہ خارج سے عائد کردہ جبر اور آمریت سے چھٹکارا

Join eBooks Telegram

دوغات

پانا آسان ہے لیکن تن آسانی اور خود فریبی کے پھندوں سے بچنا اپنی ذات اور نفس کی گرفت سے آزاد ہونا مشکل ہے
زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک مخلص رویہ اختیار کرنا، خونِ جگر سے اپنے فن کی تزئین کرنا کل
آسان تھا نہ آج آسان ہے، جن لوگوں میں اس بارِ امانت کو اٹھانے کی سکت تھی انھوں نے زبردست آندھیوں
میں بھی اپنے چراغوں کی لویں اونچی رکھیں ترقی پسندی کے کٹر سے کٹر دور میں بھی اختر الایمان، فراق، جذبی، مجید امجد
مختار صدیقی، یوسف ظفر، عزیز احمد، عصمت، قرۃ العین حیدر، بلونت سنگھ، بیدی، اور اشک جیسے فنکاروں
کی کوئی کمی نہ تھی ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے CONORMIST کہا جا سکے، ترقی پسند تحریک نے ان
میں سے کسی ایک کو اپنا بھی کہا اور ایک دور میں کسی ایک کو دھتکار بھی دیا لیکن ان لوگوں کے سینے میں تخلیق کی
جو آگ روشن تھی وہ ہر حال میں جلتی ہی رہی آج کسی تحریک میں حصہ دار بننے کی ترغیبات نہیں سیاسی مصلحتوں
پر ادبی معیار کو قربان کر دینے کے کم از کم اتنے براہ راست مطالبے نہیں رہے لیکن ان سہولتوں
(سچی لگن رکھنے والوں کیلئے یہ سہولتیں ہیں لیکن جو لوگ نمود و نمائش، بیرونی ممالک کے دوروں اور
فوری عزت و شہرت کے خواہاں ہوتے ہیں ان کے لئے یہ حالات یقیناً بڑا دشوار راستہ پیش کرتے ہیں)
کے باوجود نئی نسل تخلیق سے زیادہ ذہنی آزادی اور تشکیک کی باتوں میں مصروف ہے، آج اگر اول
درجے کا تخلیقی ادب نہیں پیدا ہو رہا ہے اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ نئی نسل علم سے، مطالعے سے اکتسابات
سے، تجربات سے، فکر و ذہن کی ریاضت سے جی چرا رہی ہے ——— "

جامعۂ اردو علی گڑھ کے کنوکیشن کے موقع پر جامعہ اردو کا ترجمان

ماہنامہ ادیب علی گڑھ

اپنی پہلی خصوصی اشاعت (مصور)

"جامعۂ اردو کا بیس سالہ نمبر" پیش کر رہا ہے

قیمت: دو روپے

منیجر ماہنامہ ادیب علی گڑھ ۲

Join eBooks Telegram

مجنوں گورکھپوری

خواجہ میر درد

میر اور سودا کے دور کی تیسری اہم ہستی خواجہ میر درد ہیں آزاد نے ان کو زبان اردو کے چار رکنوں میں سے ایک رکن، قرار دیا ہے اور مرزا مظہر جانجاناں نے میر اور سوز کے ساتھ ان کا نام گنایا ہے۔ میں خود درد کو اردو غزل کے ان ارکان میں شمار کرتا ہوں جن پر بعد کو اردو غزل کی پوری عمارت کھڑی کی گئی۔ وہ ان متبرک شخصیتوں میں سے ہیں جن کا صدق دل کے ساتھ احترام میر نے بھی کیا ہے، بعض اعتبارات سے تو وہ اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ بلند و برتر نظر آتے ہیں، وہ خاندانی درویش تھے ان کا کردار اور ان کی زندگی دنیوی کثافتوں اور آلائشوں سے اس قدر پاک تھی جس قدر کہ ایک معصوم انسان کی زندگی اپنی تمام انسانیت کو برقرار رکھتے ہوئے پاک ہو سکتی ہے، درد کا مختصر دیوان اس بات کی دلیل ہے کہ ان کو اپنے شخصی وقار کا لحاظ تھا اور وہ کسی قسم کی ناہمواری یا عدم توازن نہ زندگی میں گوارا کر سکتے تھے نہ شاعری میں، اور اگر کوئی اس معیار کو شروع سے آخر تک برت سکے جیسا کہ درد نے برتا تو یہ زندگی بہت بڑا اکتساب ہے، درد کے کلام میں نہ کسی قسم کی اخلاقی پستی ہے نہ ذہنی ابتذال اور نہ فنی نقطۂ نظر سے کسی قسم کا سستاپن۔ میر حسن نے درد کے مختصر دیوان کو کلام حافظ کی طرح سراپا انتخاب، پایا ہے، کہنے والا کہہ سکتا کہ اتنے مختصر دیوان میں ہمواری اور توازن قائم رکھنا کوئی بہت بڑا اکتساب نہیں ہے۔ لیکن میرا کہنا ہے کہ بچ بچ کر اور احتیاط کے ساتھ شعر کہنا اور اپنے کسی ایک شعر میں کسی طرح کی ناہمواری یا چھچھورا پن نہ آنے دینا خود اپنی جگہ بہت بڑا اکتساب ہے۔ آخر کوئی شعر کیوں کہے اگر شعر سے انسان کی زندگی سنور نہ سکے اردو شاعری میں اتنی مختصر کمائی کی دوسری مثال صرف اصغر گونڈوی کا کلام ہے۔

درد اپنی ذاتی بزرگی اور برگزیدگی کے لحاظ سے اپنے زمانہ میں جو مقام بھی رکھتے ہوں شاعری

Join eBooks Telegram

ہیں وہ اسی برادری کے ایک رکن ہیں جس میں میر سودا اور اس دور کے دوسرے چھوٹے بڑے شعرا شامل ہیں، ان کی شاعری کا عام لہجہ وہی ہے جو اس دور کے ہر شاعر کا ہے اور ان کی شاعری کا بھی اصلی موضوع وہی ہے جو تغزل کے تحت میں آسکتا ہے وہ اس معاملے میں اپنے دور کے تمام اکابر سے زیادہ کٹر اور سخت گیر ہیں، میر سے بھی زیادہ، میر نے تو کچھ قصیدے اور کئی مثنویاں بھی لکھی ہیں لیکن درد نے غزل کے علاوہ اگر کچھ لکھا ہے تو وہ رباعیاں ہیں اور ان رباعیوں کی بھی ممتاز خصوصیت تغزل ہے۔ سنی سنائی بات کے طور پر مشہور ہے کہ میر اثر کی مثنوی "خواب خیال" کے بہت سے اشعار درد کے کہے ہوئے ہیں اگر یہ حقیقت بھی ہو تو میری کہی ہوئی بات اپنی جگہ رہتی ہے۔ اس مثنوی کے بیشتر اشعار تغزل ہی کا انداز رکھتے ہیں۔ کچھ اشعار سنئے جن میں درد کا کردار شعری صاف جھلک رہا ہے۔

ایک میں دل ریش ہوں ویسا ہی دوست زخم کتنوں کے سنا ہے بھر چلے

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

تجھ سے کچھ ہم نے نہ دیکھا جز جفا
پھر وہ کیا کچھ ہے جو جی کو بھا گیا

دل بھی اے درد قطرۂ خوں تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

درد عاشق مزاج ہے کوئی
درد کو، قصہ مختصر دیکھا

دل بھلا ایسے کو اے درد نہ دیجئے کیوں کر
ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

ہمارے پاس ہے کیا جو کریں فدا تجھ پر
مگر یہ زندگی مستعار رکھتے ہیں!

نہیں شکوہ مجھے کچھ بیوفائی کا تری ہرگز
گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہو

میں جاتا ہوں دل کو ترے پاس چھوڑے
مری یاد تجھ کو دلاتا رہے گا!

اے آہ و نالہ مجھ سے نہ آگے چلو کہ میں
بچھڑا ہوں کارواں سے مسافر جریدہ ہوں

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے
معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے

یہی پیغام درد کا کہنا!
گر صبا کوئے یار میں گذرے

کون سی رات آن ملئے گا
دن بہت انتظار میں گذرے

Join eBooks Telegram

درد کا جب ہم تصور کرتے ہیں تو غیر شعوری طور پر ایک دھوکہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے درد کے کردار شعری کی حق تلفی ہو جاتی ہے، ہمارے ذہن پر پہلے سے یہ خیال چھایا رہتا ہے کہ درد ایک خاندانی صوفی اور درویش تھے اس لئے ہم بغیر سوچے سمجھے ان کے کلام کی سب سے زیادہ ممتاز خصوصیت تصوف اور معرفت بتا دیتے ہیں یہ بہت بڑا التباس ہے، یہ صحیح ہے کہ درد کے دیوان میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جنکو تصوف اور معرفت کے تحت لے آیا جائے۔ لیکن ان میں درد کی کوئی انفرادی شان نہیں ہے ایسے رواجی اشعار تو میر اور سودا سے لیکر داغ اور ریاض تک کے وہاں بھی مل جائیں گے اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ قدیم ترین تذکروں سے لیکر اردو شاعری کی جدید ترین تاریخ تک میں ہم کو درد کے جتنے اشعار ملتے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جن کا موضوع تصوف، معرفت یا ترک درویشی ہو، بیشتر اشعار وہی نقل کئے گئے ہیں جن کا تعلق عشق سے ہے اور جو خالص تغزل کی کیفیت رکھتے ہیں

درد کی شاعری کی صحیح قدر کا اگر اندازہ کرنا ہے تو ہم کو ارادہ اور کوشش کے ساتھ اس بات کو بھول جانا چاہئے کہ وہ سجادہ نشین خواجہ ناصر عندلیب کے خلف رشید تھے یا ان کا نسب نامہ کئی واسطوں سے خواجہ بہاء الدین نقشبند اور امام حسن عسکری سے ملتا تھا یا وہ خود خاصی جوانی کی عمر میں دنیا اور اسکی مکروہات سے منہ موڑ کر سجادہ پر بیٹھ گئے تھے، درد کے اشعار میں کہیں سے سجادہ کا رنگ یا خانقاہ کی مہک نہیں محسوس ہوتی۔ ان اشعار میں بھی نہیں جو درویشی اور معرفت کا انداز لئے ہوئے ہیں

درد کے مختصر دیوان کا زیادہ سے زیادہ حصہ عاشقانہ رنگ میں ہے اور اس رنگ میں وہ اپنا خاص انداز رکھتے ہیں جو ان کو دوسرے غزل گو شعرا سے ممتاز کرتا ہے، خالص تغزل میں وہ میر کے ہمنواؤں میں سے ہیں، سید امداد امام اثر کا قول ہے کہ سوز و گداز میں انکا جواب یا میر تھے یا وہ آپ اپنا جواب تھے

میر اور درد کا موازنہ بڑا مشکل کام ہے اس معاملہ میں نہ صرف عام پڑھنے والے بلکہ اکثر نقاد دھوکا کھاتے آئے ہیں، درد کے وہاں بھی اس قسم کی نرمیاں ملتی ہیں جو میر کے وہاں ہیں بلکہ چونکہ ان کا دیوان اتنا مختصر ہے اور سراپا انتخاب ہے اس لئے ہم کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ درد کے کلام میں میر سے زیادہ نرمیاں ہیں لیکن اگر تامل اور ادراک کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ محسوس کرنے میں دیر نہ لگے گی کہ میر اور درد شعور عشق کی دو مختلف سطحوں پر ہیں اور ان میں میر کی سطح بلند ہے، درد کے کلام میں جو ہموار نفاست اور سنجیدگی پائی جاتی ہے، ان کے خیالات و جذبات اور انکی زبان اور اسلوب میں جو شستگی اور پاکیزگی ہوتی ہے

Join eBooks Telegram

وہ ان کو اردو کے تمام چھوٹے بڑے شاعروں سے ممتاز رکھے گی۔ لیکن ہمارا یہ کہنا شاید جلد حلق کے نیچے نہ اترے کہ درد عشق اور تغزل کی اس منزل پر نہیں ہیں جس کو میر کا خاص مقام سمجھئے اور جہاں ہر منزل فردِ تر نظر آتی ہے

درد کی غزل سرائی کی عام دھن وہی ہے جو میر سے قطع نظر کر کے اس دور کے ہر شاعر کی دھن تھی وہ ہم کو قائم چاند پوری، میر اثر، یقین، تاباں وغیرہ کے عالم کے شاعر معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ وہ ان سب سے اونچا مقام رکھتے ہیں، درد کے کلام میں وہ ٹھہراؤ وہ ضبط وہ عنان گیختگی نہیں ہوتی جو صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جب زندگی اور عشق کی تمام صعوبتوں پر انسان عبور پا جائے اور عارفانہ تیور اور بے نیازانہ وضع کے ساتھ سب کچھ برداشت کر لے جانے کے قابل ہو جائے، میر ہم کو اس منزل پر ملتے ہیں یہ وہ منزل ہے جہاں غم نشاط اور اضطراب ایک بلیغ سکون میں تبدیل ہو جاتا ہے، درد کے اشعار میں جو تاثیر ہوتی ہے اس میں کسی کو کوئی شک نہیں ہو سکتا، مگر یہ تاثیر تڑپ اور تلملاہٹ کی تاثیر ہے، ہم کو ان میں وہ راحت نہیں ملتی جو میر کے کلام میں ملتی ہے، اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کم سے کم شاعری کے اندر درد نے عشق پر وہ فتح نہیں پائی تھی جو میر پا چکے تھے، درد نے اپنی زندگی میں عشق کی جتنی بھی معرفت حاصل ہو لیکن شاعری میں وہ اس درمیانی مقام پر ہیں جہاں تڑپنے تڑپانے میں لذت ملتی ہے، جہاں کلفت کلفت ہوتی ہے، جہاں زہر کسی طرح امرت نہیں بن پاتا۔

"سویرا" ۵ا سرکلر روڈ لاہور

سویرا کا تازہ شمارہ (نمبر ۲۷) شائع ہو چکا ہے اس شمارے میں مندرجہ ذیل ادیبوں کی تخلیقات شامل ہیں

چیندا ملوش۔ تراں گوکتو۔ احمد ندیم قاسمی۔ دیوندر ستیارتھی، جذبی، ناصر کاظمی، اشیر بد، مجید امجد، قتیل شفائی۔ ضیا جالندھری، منیر نیازی، محمود ایاز، شہریار

Join eBooks Telegram

علی جواد زیدی

فکرِ نو کا آغاز؟ (۲)

اردو کی محفل میں فکر و فن کے مسائل پر جو چند گرما گرم بحثیں آج کل چل رہی ہیں انکے ایک پہلو پر میں نے گزشتہ شمارے میں کچھ عرض کرنے کی کوشش کی تھی۔ میری معروضات کی اس پہلی قسط کا بیشتر حصہ ترقی پسند تحریک کے تاریخی تجربے اور نئے رجحانات سے عمومی بحث پر مشتمل تھا۔ اردو دی ہیں اور منتشر طور پر چند ایسے اسباب کا بھی ذکر کر دیا گیا تھا جو موجودہ رجحانات کے سمجھنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ بعض ناقدین نے موجودہ دور کے اردو ادب کے پرستاروں کے یہاں تشکیک یا ذہنی غیر ذمہ داری کے رجحانات پا کر انھیں شخصیت و کردار کا بحران کہہ کر ٹالنا چاہا تھا اور ان کے سماجی اسباب و علل ڈھونڈھنے کی یا تو کوشش ہی نہیں کی تھی یا کوشش بھی کی تھی تو بہت سرسری اور نا سائنسی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر یہ رجحانات ایک سے زیادہ شاعروں اور ادیبوں میں بیک وقت محسوس کئے جا رہے ہیں تو "دروں بینی" و "دروں نمائی" کے جذبات بھی خالصتہً انفرادی نہیں ہو سکتے، اسلئے میں نے گزشتہ قسط میں کسی خاص ترتیب کے بغیر اجتماعی محرکات کو یکجا کر دیا تھا۔ ان میں تو ریاضی کی قطعیت تھی نہ منطق کا احصا لیکن میں نے اتنا ابتدائی مواد جمع کر دیا تھا کہ نئے اور پرانے رجحانات اور انکی تشکیل کے مسئلے کی طرف اذہان منتقل ہو سکیں۔ آج انھیں مسائل پر ایک اور پہلو سے نظر کرنے کا ارادہ ہے

فکر و فن یا نظریہ و اسلوب کی بحث بہت پرانی ہونے کے باوجود بھی نئی ہے، کیونکہ نظریات و اسالیب بھی ارتقا پذیر ہیں۔ انسان ہر تبدیلی کا خود ہی خالق ہے لیکن وہی اپنی اس مخلوق — تبدیلی — کو دیکھکر چونکتا بھی رہا ہے کیونکہ اس تبدیلی سے ذہنی ہم آہنگی بھی طور پر اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب ہمارے سماجی روایات میں تحلیل ہو جاتی ہے، جبتک تسنراج کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور یہ کبھی ختم نہیں ہوتا انحراف کرنے والے بھی نہیں مخالفت کرنے والے بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں، مگر بعض وقت تبدیلی کے اس ارتقائی عمل میں کوئی اہم انقلاب بھی آجاتا ہے، جیسے طبعی علوم کے ساتھ مابعد الطبیعاتی اقدار سے علیحدگی کے عمل میں شدت اور تیز حرکت نمایاں ہیں۔ فلسفہ کی یاسیت اور انگریزی فلسفہ کے اسکاٹش اسکول کی لا ادریت AGNOSTICISM یا لاک، برکلے، ہیوم وغیرہ کا

Join eBooks Telegram

تصوریت کے مقابلے میں حقیقت پسندی کی طرف رجحان، اسپنسر اور الگزینڈر وغیرہ کی ارتقائیت سے جیمس کی افادیت پسندی تک فکری ارتقا کا ایک سلسلہ ہے جو حقیقت اور صداقت کو عقل و منطق کی ترازو میں تولنے کی کوشش کرتا رہا ہے اور عقیدے، تقلید اور توہم پرستی کی بنیادوں کو ہلاتا رہا ہے، ذہن انسانی کو ایک دھکا مارکس کی مادی جدلیت نے انقلاب روس کی شکل اختیار کر کے پہنچایا اگر پہلے فکری سطح پر ہم ان عناصر سے نبرد آزما ہوئے تھے جو مذہب کی آڑ میں ہمارے پاؤں میں بھاری زنجیریں ڈال رہے تھے تو اب ہم نے سماجی استحصال کا قلع قمع کرنے کی تگ و دو میں سرمایہ داری کی مضبوط حصاروں کو توڑنا چاہا اور ذہنی توہمات سے زیادہ طبقاتی جدال پر ہماری نگاہیں جم گئیں یہی نہیں ہوا بلکہ فکری محاذ پر ہمارا طرزِ عمل ہی بدل گیا

پہلے فرد و کائنات کے مابین ایک کشمکش سی تھی، ہر شئے خیال ہے، یا ہر شئے کا کوئی ذاتی وجود ہے یا ہر شئے کسی وجود مطلق کا پرتو ہے یا حقیقت ہمارے انا کا عکس ہے یہ اور اسی قماش کی دوسری بحثیں پس پشت جا پڑیں جدلیاتی مادیت نے فرد و کائنات کے مابین ایک سماجی اور اقتصادی رشتہ قائم کر کے بہت سی الجھنوں کو دور کر دیا کیونکہ جدلیاتی مادیت نے یہ واضح کر دیا کہ فرد و کائنات کے درمیان خدا واسطے کا بیر نہیں ہے بلکہ سماجی تعلقات ہی ذہن انسانی کی تشکیل کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں علم و وجود میں جو باہمی دو طرفہ رشتہ تھا وہ انفرادی نہ تھا بلکہ معاشی تھا، جب تک فلسفہ اس رشتہ کو انفرادی قرار دے کر بحثوں میں الجھا رہا ان کا بقول اکبر یہ عالم رہا کہ ع

ڈور کو الجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

لیکن اس کو یہ سرا مل گیا تو معلوم ہوا کہ پچھلی تگ و دو بے سود تھی کیونکہ وہ سماجی مقصدیت سے عاری تھی

اسی طرح طبیعیاتی فکر نے کچھ اور چھلانگیں لگائیں، آئنسٹائن کی اضافیت نے نیوٹن کی حرکیات کے زمان مطلق یا مکان مطلق کے تصور کی بنیادیں ہلا دیں، لیکن اس اضافیت میں بھی ایک مطلق مکانی، دہری تسلسل CONTINUUM ملے گا جو تری میٹری اصطلاحوں ہی میں ظاہر ہو سکتا ہے اور میٹری اصطلاحیں کمیت کو تو گھیر سکتی ہیں لیکن کیفیت کا احصا نہیں کر سکتیں۔ جدلیاتی مادیت نے اس کشمکش سے بھی عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ ارتقا، تغیر یا معرضِ وجود میں آنے کی کیفیت اور وجود مطلق نہیں اگر مارکسیت یہ نہیں کہتی کہ یہ زمان و مکان میں ہوتی ہے کیونکہ اس سے تو زمان و مکان دونوں ہی مطلق حقائق بن جائیں گے بلکہ انھیں وہ ایسا عمل مانتی ہے جن سے خود زمان و مکان رستے رہتے ہیں"

مگر ان مسائل سے نبرد آزمائی کر ہی رہی تھی کہ ٹکنالوجی کی ترقی نے ایٹمی توانائی کے رازوں کو پایا اور

Join eBooks Telegram

اب یہ علم جو عام انسانوں کے ہاتھوں بلکہ ریاستوں یا مٹھی بھر سائنسدانوں کے ہاتھوں میں ہے، ایک نیا سوالیہ نشان بن گیا ہے۔ انسان نے افراد پر فتح پائی ہے، مظاہر فطرت پر فتح پائی، استحصالی طبقوں پر فتح پائی لیکن کیا وہ ان ہلاکت آفریں امکانات پر بھی فتح پا سکے گا جو اس ایٹمی دور میں اپنے آتے جا رہے ہیں، جب تک خالص فکری یا نظریاتی بحثیں تھیں تو بحث کرنے میں بھی لذت محسوس ہوتی تھی لیکن اب تو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا ہے۔ ہمارا انفرادی ہی نہیں اجتماعی وجود خطرے میں ہے، اجتماعی بھی طبقاتی یا جماعتی نہیں بلکہ انسان کا کائناتی وجود، آفاقی وجود، چند مہلک ہتھیاروں کے بس میں ہے۔ جس قیامت کبریٰ کا تصور مذہب نے دیا تھا، اس کو تو ہم نے ٹال دیا لیکن یہ ایک اور قیامت کبریٰ سر پر کھڑی ہے، ایک تلوار کچے دھاگے میں بندھی ٹھیک سر کے اوپر لٹک رہی ہے اور ہم کو سائنس نے اور ریاست نے جکڑ رکھا ہے۔ بس ایک سوئی چبھنے کی دیر ہے پھر چند دھماکے اور دنیا کا خاتمہ! یہ ہیں بھیانک امکانات جو ٹکنالوجی نے ہمارے سامنے لا کھڑے کئے ہیں۔ اس میں کیسی فکر، کیا نظریہ، کیا فن، کیسے طبقات اور کیسی ریاستیں؟ مگر کیا اس کو روکنے کیلئے ہم کچھ کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے اور کائنات کے وجود کو بچا سکتے؟ اگر نہیں تو پھر فلسفہ و منطق، روحانیات و اخلاقیات، سماجیات و اطلاقیات سب بے سود ہیں؟ ہماری یاسیت، کلبیت، نرگسیت، خیامیت، سب کا جواز موجود ہے اگر ہم اس تھوڑے سے وقفے میں جو آج اور قیامت کے مابین باقی ہے، جو کچھ کر سکتے ہوں کر لیں، رو لیں یا ہنس لیں، اپنا اور دنیا کا مذاق اڑا لیں یا اس سب کو مایا جال اور فریب نظر تصور کر لیں، عبادات میں مصروف ہو جائیں یا توہمات کے دامن میں جا کر پناہ لیں! ہمیں کیا پانا اور کیا کھونا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم آج ایک ایسے ہی بے اعتبار اور خطرناک موڑ پر آ پہنچے ہوں۔

جو اذہان تبدیلیوں کے ترقی پذیر تصورات سے ہم آہنگ تھے وہ بھی اپنے کو گویا ایک خلا میں محسوس پاتے ہیں۔ خاندان نہیں رہ گیا، گاؤں کی اکائی نہیں رہ گئی، صنعتی شہر اور ملک کی بنیادیں ہل گئی ہیں اور انسان آفاقی اور کائناتی وسعتوں اور پہنائیوں میں گم سم کھڑا ہے، یہاں تک فطری ہے لیکن اس کی یہ حیرت اس حیرت سے مختلف ہے جو انسان کو بدو فطرت میں رہی ہو گی، وہ حیرت جو اشیا کے قریب لیجاتی ہے، چھونا اور پرکھنا سکھاتی ہے اور اشیا کو مابعی معنویت دیکر نہیں بلکہ ان کی سماجی اہمیت معلوم کر کے ان کو اپناتی ہے وہ اس حیرت سے بالکل ہی مختلف ہے جو عجز کی پاشکستگی بن جاتی ہے۔ اس وقت انسانیت کے بہت بڑے حصے پر لاشعوری طور پر ایسی ہی حیرت طاری ہے، ایمان میں ان لوگوں کی بات نہیں کرتا ہوں جو اس

Join eBooks Telegram

تغیر کو محسوس ہی نہیں کر رہے ہیں) کہا جاتا ہے کہ اب سے کوئی ۲۲۰۰ برس پہلے آرکیمڈیز نے کہا تھا کہ "مجھے کھڑے
ہونے بھر کی جگہ دیدو تو میں اس دنیا کو اس کی جگہ سے ہٹا سکتا ہوں۔" اس غریب کو تو وہ جگہ مل نہیں پائی لیکن
آج ٹکنالوجی کے عظیم الشان فتوحات نے بعض طاقتور سیاسی گروہوں کو "وہ کھڑے ہونے بھر جگہ" دیدی
ہے اور ان کے ہاتھ میں وہ امکانات رکھ دئے ہیں کہ وہ چاہیں تو اس دنیا کو اسکی جگہ سے ہٹا دیں یا اسے ختم ہی
کر دیں! ان فتوحات و امکانات نے ہم میں عاجزانہ حیرت زدگی پیدا کر دی ہے اور ایسا محسوس ہو رہا ہے
جیسے ہم ایک عضو معطل یا مشین کے ایک بے ارادہ پرزے بن گئے ہوں، مشین بند ہے تو ہم بھی رکے پڑے ہیں مشین
چل پڑی تو ہم بھی کھٹ کھٹ کر کے چلتے رہیں گے اور چلتے چلتے اس مشین کے ساتھ ہی ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائینگے
یہ حیرت زدگی بھی کلبیت، یاسیت، نرگسیت اور اسی طرح کے تمام غیر فطری رجحانات کیلئے وہی عمل کر رہی
ہے جو بھڑکتے شعلوں کیلئے تیل! ذرا غور تو کیجئے کہ اس خوفناک نقشے میں ادیب اور شاعر کہاں ہے؟ وہ
پہلے غریبی، جہالت اور مرض کی باتیں کرتا تھا، غلامی اور استحصال کا سوال اٹھاتا تھا اور انھیں کو سب سے
بڑا خطرہ مان کر ہمیں ان کے استیصال پر ابھارتا تھا، آج خود انسانیت کا وجود خطرے میں ہے اور اس
خطرے سے فرار کی راہ اسے دکھائی نہیں دے رہی ہے، شاعر اور ادیب کے پاس صرف لفظوں کا نشتر ہے، جس کا تیر ہے
وہ اس جنگ میں شریک کیسے ہو؟ امن کا نعرہ، امن کی مانگ جنگ کیخلاف احتجاج احسین الفاظ ہی تو ہیں
کیا یہ ایٹمی ہتھیاروں کے ان پشتاروں کا جواب ہو سکتے ہیں جو روس اور امریکہ کے پاس موجود ہیں، جو
برطانیہ، کناڈا اور فرانس بھی بنا رہے ہیں اور کئی ایک اور ملک جنکے رازوں کو پا چکے ہیں اور بنانے کی صلاحیت
رکھنے لگے ہیں، شاعر کیا امن کا نعرہ لگائے گا! ایٹمی ہتھیاروں کا پشتارہ لگانے والے یہ نعرہ بھی ان سے چھین
کر لے گئے ہیں اور عظیم الشان سامان نشر و اشاعت کے ساتھ دنیا کے کونے کونے میں اس نعرۂ امن کو پھیلا
بھی سکتے ہیں، جب یہ سب ہو ہی رہا ہے تو شاعر اور ادیب کیا صرف عالمی سیاسی گروہوں کے سربراہوں
کی ہاں میں ہاں ملائیں؟ کیا شاعر و مفکر کا بس یہی کام رہ گیا ہے، کہیں یا تو نہیں کہ ادیب و مفکر
کو یہ محسوس ہونے لگا ہے کہ انسانی قسمت کا فیصلہ یہ فنا خیز پشتارے کریں گے، انسان نہیں کرے گا۔
اور ابھی تک وہ شعری اور فکری جادو ایجاد نہیں ہوا ہے جو ان پشتاروں کو متاثر کر سکے، شاید وہ اسی لئے عزلت
میں محصور ہونے لگا ہے۔ اس سے زبان کھونے کی سبیل تو نکلتی ہے، کسی دل میں کوئی ہمدردانہ تاثر تو پیدا ہوتا
نعرۂ امن نہ سہی، شاعر سوشلزم، آزادی، مساوات کے گیت گائے، کل تک تو وہ گاتا تھا لیکن آج

Join eBooks Telegram

وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ کائنات ہی دھواں ہو جانے کو ہے (یعنی دھواں ہو جانے کا خطرہ ہے) تو آزادی اور مساوات کہاں اور کس کے لئے قائم ہوگی؟ ادیب کیلئے انسان کیا مجموعی طور پر یہ کائنات ہی ایک معمہ بنگئی ہے۔ وہ اس انسانی معمہ کو حل کرنا چاہتا ہے تو کوئی ایرش فرام اس کو آواز دیتا ہے کہ آزادی کی باتیں کیا کرتے ہو آج تو جدید سرمایہ داری ایسے مشینی آدمی پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے جو آزاد، خود مختار یا پابند، ضمیر نہیں ہے وہ کسی جبر کے بغیر پسند خاطر راستوں پر چلتے ہیں۔ سوال ہے کہ انسان کو ROBOT بننے سے کیسے بچایا جائے غلام بننے سے بچانے کا سوال پرانا ہو چکا ہے، کل انسان کا مشین بنجانا ایک طعنہ تھا کیونکہ انفرادی آزادی میں بھی بڑی معنویت تھی لیکن آج ریاست یا سماج کے نام پر انسان نے خوشی خوشی ہزاروں پابندیاں اپنے اوپر عائد کرلی ہیں کیونکہ وہ سماجی مشین کا فعال اور حساس پرزہ ہے، آج سماجی زندگی، وسیع تر آفاقی زندگی سے اس طرح مربوط ہوگئی ہے کہ وسیع تر آفاقی یا سماجی مشین کو منظم طور پر چلائے رکھنے کیلئے اس ضمنی یا تحتی مشین (فرد) کا ہموار یا ہمدردانہ چلتے رہنا ضروری ہے، بڑی مشین سے منسلک رہنے کی پابندی کا مفہوم ہے، انفرادی آزادی کی برضا و رغبت قربانی، یہ معمہ پہلے ہی سے ابھر رہا تھا لیکن اس کی عظمت و وسعت کا احساس اب ہوا ہے کیا ہم اس کو انسانی اقدار کے زوال کا نام دینگے؟ کیا عملاً انسانی اقدار کا زوال پذیر ہونا ممکن ہے؟ کیا دنیا۔ اور انسان بھی ترقی کی طرف نہیں جا رہے ہیں؟ کیا ہمارا معاشرہ ترقی معکوس کر رہا ہے یا زوال پذیر ہے یہ سوال اب شدت سے ابھر رہے ہیں۔ محمد حسن کا خیال ہے (دیکھئے ان کا مضمون "عہد جدید کا ذہنی پس منظر") کہ "جدید تحقیقات اور تعلیمات نے انسان کے شکست پندار کا عمل پورا کر دیا ہے" محمود ایاز نے "انسانی اقدار کے زوال کے محرکات کی تشخیص اور چارہ گری" کا سوال اٹھایا ہے۔

آیئے ذرا مسئلہ کو ان کھنگالیں میرے خیال میں انسان سحر ہیں بدو فطرت کی آزادانہ سنکنے والی ہوائیں، مرغان خوش الحان کے چہچہے اور مشکبار فضائیں، اسکے دنوں میں سرمئی بادلوں کے تیرتے ٹکڑے، جلوۂ جاناں کی حشر سامانیاں اسکی شاموں میں قلقل مینا اور سرد و سمبایہ کی لطافتیں اور اسکی راتوں میں شبستانوں کے چراغوں کی جگمگاہٹ، نیلگوں آسمان پر ستاروں کی آنکھ مچولیاں اور خوابوں کی جنتیں آج بھی موجود ہیں لیکن یہ لذتیں اور لطافتیں، دلکشیاں اور دلفریبیاں اب انفرادی نہیں رہ گئی ہیں بلکہ اجتماعی اور جماعتی ہوگئیں ہیں اور ان کے علاوہ بہت سی نئی لذتیں اور لطافتیں بھی پیدا ہوگئی ہیں۔ جماعت کے سحر و شام اور روز و شب کا صرف پرتو انفرادی محسوسات ہیں اگر کوئی فرد جماعت وماحول سے گہرے رشتے کا احساس

Join eBooks Telegram

نہیں رکھتا تو وہ آج اس بھرے سنسار میں اپنے لئے جگہ نہیں ڈھونڈھ سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا ہمیں آج بھی جو کچھ دے رہی ہے اس میں سب تو نہیں لیکن بہت کچھ اب بھی محبت کرنے کے قابل ہے لیکن ہمارے بعض متوسط طبقے کے ادیب اور شاعر آج کی تیز رو اور پیچیدہ زندگی کے اس اہم پہلو کو محسوس نہیں کر پاتے ہیں، اگر دنیا میں اب بھی دلکشی نہ ہوتی تو ہم کائنات کے خوفناک انجام سے خائف ہی کیوں ہوتے اور ہم اس دوزخ دنیا کو بچانے کی تدبیریں ہی کیوں سوچتے؟ آج بھی اس خیال کا دل میں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ زندگی میں اب بھی بہت سے محاسن ہیں اور دنیا میں اب بھی بڑی لطافتیں ہیں جنکی حفاظت کیلئے ہمیں کمربستہ ہو جانا ہے۔ مگر ہم نے تو تصویر کا دوسرا ہی رخ دیکھنے کی قسم کھالی ہے، نفرت، بغض، عداوت، حرص، طبقاتی جنگ، سرد جنگ، ایٹمی جنگ کے بھیانک امکانات، تخریب، تحریص، لسانی جھگڑے، علاقائی تفرقے، مذہبی اختلافات، رواداری کا فقدان، دروغ بافی، استحصال، غلامی، غداری، بے وفائی —— کتنا ڈراؤنا جلوس ہے جو ہمارے یک چشم نقاد ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں اور قیامت یہ ہے کہ اس جلوس میں جھنڈا بھی انھیں کے ہاتھ میں ہے!

لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ جلوس دنیا کا صرف ایک پہلو ہے، کل کائنات نہیں ہے یقیناً یہ سب سے نمایاں پہلو ہے لیکن ایک پہلو کے نمایاں ہو جانے سے دوسرے پہلوؤں کا ابطال نہیں ہوتا۔ میں تو ایک قدم اور آگے چل کر یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ ادیب شاعر اور دانشور کے نقطۂ نظر سے وہ پہلو زیادہ اہم ہیں جن پر نگاہیں کم پڑتی ہیں یا بالکل ہی نہیں پڑ رہی ہیں، یہ علم و ادب کے خادم جنکی عقل دوررس اور نگاہ دوربیں ہے۔ ان کی نظر تو کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں کے ہر پہلو پر ہونا چاہیئے بلکہ انھیں ان تبدیلیوں کو دیکھ کر مستقبل کی تبدیلیوں کا بھی پتہ لگانا چاہیئے، ایک دانشور صرف حال کی شکست و ریخت ہی کو نہیں بلکہ ماضی کے کاخ ہائے بلند کو بھی دیکھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ یہ بلند عمارت پتھر کے پرانے ہونے کی وجہ سے گر گئی ہے یا نئی عمارت بنانے کے خیال سے عمداً گرائی گئی ہے۔ انسان کا پندار ٹوٹا ہے یا اس کے دیرینہ اقدار ٹوٹے ہیں یا وہ مشین بنا ہے تو اس میں معنگی کیا ہے،؟ انسانی سماج میں دولت کی پیداوار اور تقسیم کے موجودہ نظام میں جو اندرونی تضاد تھے وہی تو ابھر رہے ہیں، ہم یہ کیوں نہیں دیکھ پا رہے ہیں کہ اسی تضاد کی کوکھ سے ایک نیا انسان جنم لینے والا ہے، جو ہے تو انسان ہی مگر اپنے پیشرووں سے کیفیات کے اعتبار سے بہت ہی مختلف ہے، اس لئے جسے دنیا سے اور انسان سے سچی محبت ہوگی وہ جاتی دنیا کا نوحہ خوان نہیں بنے گا، بلکہ وہ محنت کشوں کے زاویہ نگاہ کو اپنائے گا، وہ گزرتے ہوئے لمحوں کو للکارے گا کہ جب دنیا ختم ہوگی تو ہوگی، لیکن جب تک

Join eBooks Telegram

ہے اس کو رہنے کے قابل بنائے رکھنا ہوگا بلکہ اور حسین بنانا ہوگا اور مفید بنانا ہوگا۔ یہ حیات۔ یہ حسین ترین شئے۔ جب تک اپنی ہے، محبت کرنے کے قابل ہے جب رہے گی تو محبت یا نفرت کا سوال بھی نہ رہیگا لیکن ابھی تو ہے! یہ حال کی پریشانیوں میں الجھ کے رہ جانا مستقبل کے مرف بھیانک خواب دیکھنا اور حال کے ان پہلوؤں سے یکسر نگاہیں موڑ لینا جن میں محبت ہے، انس ہے، کسر نفسی ہے، ہمدردی ہے اور درد دل ہے، دراصل ایک سماجی مرض کی علامت ہیں۔

جب کوئی طبقہ اپنی سماجی افادیت اور اہمیت کھونے لگتا ہے، جب اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکنے لگتی ہے (جیسے آجکل متوسط طبقہ) جب جہد للبقا کیلئے اسے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ جھک کے محنت کشوں سے ملے اور ان میں مدغم ہوجائے یا استحصالیوں کا ساتھ دیتا رہے، جب اس کے سامنے ایک طرف سیم و زر کے ڈھیر ہیں جو پست تر ذہن کے قبضے میں ہیں اور دوسری طرف محنت و عمل ہے جس کی اسے عادت نہیں تو وہ علی العموم بے عملی کے فلسفوں کو اپنا لیتا ہے، اس وقت اس کو کائنات میں عیب ہی نظر آتے ہیں اس کے لئے انسان معمہ بن جاتا ہے، اس کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اب دنیا غار تباہی کے کنارے کھڑی ہے اور کوئی طاقت اسے پیچھے سے دھکا دیکر اس غار میں گرا یا ہی چاہتی ہے۔ ذہنی شکست خوردگی کے اس عالم میں تمام انسانی اقدار، سچائی، خلوص، محبت، آزادی، مساوات، ترقی اس کے لئے بے معنی بن جاتی ہے اور پھر یہ شکست خوردہ انسان گھونگھے کی طرح اپنی ذات کے خول میں سمٹ سمٹا کر بیٹھ جاتا ہے، اور وہاں بیٹھے بیٹھے دنیا کو، دنیا کی تغیر پذیری کو، کوستا رہتا ہے، اس کو دراصل یہ نظر نہیں آتا کہ اس تغیر میں کوئی بڑی برائی سوائے عجلت اور برق دشتی کے نہیں ہے، ایجادات اور معلومات نے ہم سے ذہنی اور جسمانی آرام طلبی کے مواقع چھین لئے ہیں۔ اب تک حالات سے جھجکتے اور دھیرے دھیرے اپنے کو ان تغیر پذیر حالات کے مطابق بناتے رہے، جب تک تبدیلیوں کی رفتار سست تھی یہ بات کسی حد تک نبھ جاتی تھی لیکن جب یہ رفتار بجلی کی رفتار سے بھی تیز اور آواز سے بھی زیادہ سریع ہوگئی اور ہم جب تک ایک تبدیلی سے کچھ ہم آہنگ ہوں، دوسری تبدیلی دروازے پر دستک دینے لگی تو سکنڈ، منٹ گھنٹے اور دن ہی نہیں بلکہ ہفتے، مہینے اور سال بھی اپنی بہت سی زمانی معنویت کھو بیٹھے، ہم یہ جانتے ہوے بھی کہ ہر لمحہ کی ایک قیمت ہے، اس احساس سے ہراساں ہوئے جارہے ہیں کہ یہ لمحے بیحد گریزاں بھی ہیں، قیامت کی بھاگ دوڑ ہے اور اس بھاگ دوڑ میں قیامت کی نفسی نفسی اور سٹہ بازار کی سی سراسیمگی ہے، سٹہ بازار میں

Join eBooks Telegram

بازار بھاؤ کے اتار چڑھاؤ کی بڑی اہمیت ہے اور پیش گوئی سے بڑی موانست۔ آج ہر لمحہ کے پیچھے دوڑتے وقت بھی خیال بازار بھاؤ پر ہی جما ہوا ہے۔ ہر فرد یہ سوچتا ہے کہ اسکی ایک قیمت اور ایک بازاری مول ہے لسے جلد سے جلد بک جانا چاہئیے گویا انسان کی قدر و قیمت بازار بھاؤ سے ناپی جانے لگی ہے۔ گویا انسان کی ایک قیمت مقرر کر کے اسے ایک شیشے کی الماری میں الگ رکھدیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے وہ خریدے اور کلرک، استاد، افسانہ نویس، شاعر، صحافی ناقد، انجینئر یا مزدور بنالے اب متوسط طبقے کا ہی زادیہ نگاہ بنا جاتا ہے، مذہب روحانیت کو تو اس نے توہمات کے رجسٹر میں درج کر کے الگ ہی رکھدیا تھا، پھر اس نے ریاست کا بت بنانا چاہا اور ساری امیدیں اسی سے وابستہ کر کے اس کو ایک نیا قاضی الحاجات بنایا پھر بھی اس کی تمام ذہنی خواہشات کی تشفی کیسے ہو سکتی تھی کیونکہ اس نے رفتہ رفتہ اپنی سماجی افادیت کھودی تھی اور وہ آرام طلبی کی تلاش میں ان تمام اقدار سے کنارہ کش ہوتا گیا جو اسے سماج اور کائنات سے ہم آہنگ اور قریب تر رکھتیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ تھوڑی بہت کوشش بھی کرتا رہا ہے، ہاتھ پاؤں بھی مارتا رہا ہے، ہنستا، بولتا، روتا، چیختا، گاتا اور بجاتا بھی رہا ہے، اس نے کبھی کبھی علم کی نمائش بھی کی ہے اور جنون کی حدوں تک بھی پہنچا ہے لیکن یہ سب اس نے کٹھ پتلیوں کی طرح کیا ہے، پس پردہ ڈور کوئی اور کھینچتا اور ڈھیلی کرتا رہا ہے، یہ سرمایہ داری کی کرامتیں تھیں، جس نے انسان کو اور ریاست کو اپنے ہاتھ میں ایک آلۂ کار بنالیا تھا، بڑے بڑے صنعتی شہروں میں جاکر محسوس ہوتا تھا، ہر آدمی دوڑ رہا ہے، بھاگ رہا ہے، موٹریں، ریلیں، مشینیں چل رہی ہیں، بازار سجے ہیں، لکھوں، مہا سنکھوں میں سودے ہو رہے ہیں، ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہا ہے اور اس صفائی سے کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ آداب عرض، نمسکار اور مصافحہ تو کیا، بغل گیری اور بوسہ میں بھی دلوں کی گرمی محسوس نہیں ہو پاتی تھی پھر انسان نے سوچا کہ سماجی مساوات اور اشتراکی طرزِ حیات ہی اس کا حل ہے، وہاں بھی بات، اسٹالین کی شخصیت نوازی تک جا پہنچی، تب کرد شچیف نے قدم دوسری طرف بڑھایا، ہندستان نے فلاحی ریاست کا اشتراکی تصور پیش کیا تاکہ فرد پھر اپنے اصلی مرتبہ کو پا سکے، لیکن سماجی مرتبہ کے تانے بانے کے اندر! مختصر یہ کہ چونکہ ترقیاں ہمہ جہانی، تنوع اور ماحول زمان و مکان کے مطابق، دنیا کے مختلف حصوں میں وجود پذیر ہو رہی ہیں اور مختلف طرح کے تضاد ابھر رہے ہیں اور نئی نئی شکلوں کو جنم دے رہے ہیں، اس لئے مفکروں اور دانشوروں کے اس طبقہ پر جس کی نگاہیں صرف ایک محور پر جمی ہیں کہ اس تصادم

Join eBooks Telegram

ہیں فتح مند طاقت کون اور کہاں ہے، سراسیمگی اور بدحواسی طاری ہے وہ خود ان تبدیلیوں میں ایک خلاق یا ارتقا پسند کارکن کا کردار ادا نہیں کر رہا ہے، اسی لیے وہ نہ تو ماضی کے اقدار سے وابستہ رہ پاتا ہے اور نہ حال کے اسے اب بھی یہ پوری طرح محسوس نہیں ہو رہا ہے کہ فتح و شکست کے قدیم معیاری بدل گئے ہیں اب پورے کے پورے نظام نبرد آزما ہو رہے ہیں اب جنگ کی نوبت کھلم کھلا بلاکوں تک پہنچی ہے، صرف ریاستوں کی بات نہیں رہ گئی۔

بلاکوں اور نظاموں کی جنگ میں جسے کوئی مشرق و مغرب کی جنگ بتاتا ہے اور کوئی سرمایہ داری اور اشتراکیت کی اور کوئی جمہوریت اور آمریت کی، ایک نیا سوال کائنات کا بھی ابھرا ہے، یہ جنگ جو خوفناک ترین ہتھیاروں سے لیس بلاکوں اور نظاموں کے مابین سرد محاذ پر چھڑی ہوئی ہے اور کسی وقت بھی گرما سکتی ہے، اتنی ہلاک بھی ہو سکتی ہے کہ کائنات ہی کو لے ڈوبے، اسی لئے ہندوستان اور دوسرے ممالک نے ایک آزاد اور صلح جو غیر متحارب اور غیر جانبدار حلقہ عمل بنا لیا ہے اور اس آفاقی ہلاکت سے بچنے کی تدبیریں سوچ رہے ہیں اور بروئے عمل لا رہے ہیں، بہت سے لوگ کائناتی وطنیت کے خواب کی عملی تعبیریں ڈھونڈ رہے ہیں، یہ ایک خاص سمت میں حرکت ہے، کیا آج بھی ہندوستان کی غریبی افلاس، جہالت کا مسئلہ آفاقی مسئلہ نہیں بن گیا ہے، کیا پسماندہ اقوام کی فلاح کے سوال سے امریکہ اور روس کو ہمدردی نہیں ہے؟ کیا ہم یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ سامراج، ہمیشہ کیلئے فنا ہو چکا ہے، چھپکلی کی کٹی ہوئی دم بھی تھوڑی دیر ناچ، تھرک کے ہمیشہ کیلئے خاموش ہو جائے گی، کیا ہر جگہ مساوات و اشتراک ایک خاص شکل اختیار نہیں کر رہے ہیں؟ اگر ابر سیاہ کے گھٹا ٹوپ میں روشنی کی باریک سی نقرئی لکیریں بھی کہیں نظر آ رہی ہے تو ہم موجودہ معاشرہ کو یا اعلیٰ اقدار کو رو بہ زوال کیسے اور کیوں کہہ رہے ہیں اور اسے ورثہ کا کرب کیوں نہیں مانتے۔

یہاں میں ان لوگوں سے اپنے اختلاف کو واضح کر دینا چاہتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ اخلاقی اور روحانی اقدار رو بہ زوال ہیں، اخلاقی اقدار، اقدار مطلق نہیں بلکہ اقدار اضافی ہیں ـــ ہر دور میں وہ قبائلی اور جاگیردارانہ ہو یا سرمایہ دارانہ و اشتمالی ہو مخصوص اخلاقی مسائل ابھرتے ہیں اور روحانی افکار پرورش پاتے اور ترقی کرتے ہیں، ان میں روایات کی طرح مماثلت و یگانگت تو باقی رہتی ہے، لیکن اس یگانگی کے باوجود ان میں وہ اختلافات بھی ہوتے ہیں، جن میں ایک دوسرے سے پہچانے جا سکتے ہیں، ہم اخلاقی اور روحانی اقدار کو فرد اور فرد، فرد اور سماج اور فرد اور کائنات کا وہ باہمی رشتہ بھی کہہ سکتے ہیں جو صدیوں کی شکست و ریخت نے بنایا

Join eBooks Telegram

ہے اور جبلّی جڑیں، احول اور سماج میں دور دور تک مکڑی کے جالے کی طرح خانہ بخانہ پھیلی ہوئی ہیں، چونکہ اقدار باہمی سلوک سے وجود میں آتے ہیں اس لئے وہ ہمیشہ ہمیں اپنی ذات کے ماوراء حقائق کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، یہ اقدار محبت، حسن، ہمدردی، صداقت وغیرہ کے خد و خال اس لئے متعین کرتے رہتے ہیں کہ انسان کی اس بے رنگ مادی زندگی میں — بھوک اور جنس کی مادی زندگی میں — کچھ نئے رشتے پیدا کر کے اجتماعی زندگی کی مسرتیں اور حلاوتیں یکجا کرے۔ ان رشتوں کو ہم جتنی شدت احساس کے ساتھ اپنائیں گے، ہم اپنی زندگی کو اتنی ہی سماجی معنویت عطا کریں گے اور بامقصد بنائیں گے لیکن یہاں یہ لطیف نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس ہر لحظہ متحرک دنیا میں، فرد، سماج، کائنات، کوئی بھی جامد نہیں ہے، اسی لئے باہمی رشتے بھی بدلتے رہتے ہیں، جب ہماری زندگی کا محور خاندان تھا تو خاندانی رشتے بہت مضبوط تھے، پھر یہ رشتے ٹوٹے، ہمسائیگی کے رشتے ٹوٹے، علاقائی رشتے ٹوٹے اور قومی رشتوں کی گرفت بھی بڑی حد تک ڈھیلی ہوگئی، ہم نے خاندان، ہمسائیگی اور وطنیت کے جو رشتے توڑ پھینکے ہیں وہ کلیتہً فنا نہیں ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے اپنی اقتصادی اور سماجی معنویت ذرا ہمت بدل لی ہے اور وسیع تر انسانی رشتوں میں آفاقی اقدار میں تبدیل ہو رہے ہیں، یہ ایک لمحۂ گراں ہے گزر جائے گا اور اس عبوری دور میں جو بحران کا احساس سا ہو رہا ہے، باقی نہ رہے گا

یہ انسانی رشتہ جو ابھر رہا ہے بہت دور کا ڈھول ہے، سہانا سہی مگر ہے بہت دور کا! پہلے جو رشتے تھے وہ قریبی تھے اور اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے تھے، پھر ہم نے ان کے گرد رسوم و روایات کا ایک جال سا بن دیا تھا، ہم نکلنا چاہتے تو قبیلہ، ذات برادری، خاندان، علاقہ، ملک، مذہب اپنے اقدار و احتساب کو ہمارے راستہ میں دیوار بنا کر کھڑا دیتا، چونکہ سماج کو اپنی اقتصادی ضروریات کیلئے یہ دیواریں گرانا ہی پڑیں، اس لئے صرف ایک مبہم سا انسانی رشتہ ایسا رہ گیا جو معاشرہ کو انتشار سے بچا سکے یہ نیا آفاقی رشتہ جو ابھر رہا تھا اس کو اخلاقی اور روحانی لباس سے آراستہ کرنے کیلئے اور پھر اس آرائش کو مادی بنانے اور زندگی سے قریب تر لانے کیلئے کچھ انسانی اقدار کے ابھرنے کی ضرورت تھی، لیکن ہماری بین الاقوامیت ابھی تک ایک واضح تصور کے آگے نہیں بڑھی ہے، کچھ بین الاقوامی CONVENTIONS ضرور بنے ہیں، لیکن ابھی تک ان کی حیثیت صرف بین الریاستی ہے اور یہ پوری طرح سے افراد کی زندگی میں داخل نہیں ہو سکے ہیں، کچھ ثقافتی وفود جانے لگے ہیں، کچھ بین الاقوامی ادارے بھی قائم ہونے لگے ہیں

Join eBooks Telegram

لیکن ان کی نوعیت بہت ہی سطحی اور بعض حالتوں میں کاروباری ہے، صحیح قسم کے آفاقی روایات اور انسانی رشتوں کے وجود میں آنے کو وقت درکار ہے، کیونکہ بین الاقوامیت کے راستے میں گری ہوئی دیواروں کا جو ملبہ پڑا ہوا ہے اس کو صاف کرنے میں بھی وقت لگے گا اور جب تک یہ ملبہ صاف نہیں ہو جاتا یہ بجائے خود ایک رکاوٹ ہے، مادی تبدیلیاں نسبتاً جلد ہو جاتی ہیں، لیکن تصورات، معتقدات، روایات و رسوم میں تبدیلی دھیرے دھیرے ہی ہوتی ہے

انسانیت کا نام لے لینا، انسانیت کی قسمیں دیدینا آسان ہے لیکن صحیح انسانی اور آفاقی اقدار کو اخلاقی روحانی اقدار کے سانچے میں ڈھالنے کی باقاعدہ کوشش کرنا ایک دوسرا ہی مسئلہ ہے، سب سے پہلے ہمیں شدت سے یہ محسوس کرنا ہے کہ آج جب کہ سائنس نے زمان و مکان کے فاصلے کم کر دئے ہیں، ہمارا خاندان، قبیلہ اور ملک بڑھکر دنیا بن گیا ہے خاندان، قبیلہ اور ملک کے رشتے بھی ہم نے ضرورتاً بنائے تھے اور اب ایک آفاقی خاندان بھی ضرورتاً بنانا ہے، کیونکہ انسانیت کے بقا و تحفظ کی یہی ایک سبیل ہے، آج ہم وسیع تر خاندان، وسیع تر قبیلہ، اور وسیع تر ملک بنانا چاہتے ہیں اور ہم بعض اوقات یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم ایسے بن ہی گئے ہیں یہ ابلہ فریبی ہے۔ آج جبکہ عملاً ہمارے دل میں خاندان قبیلہ اور ملک کیلئے کوئی ولولہ اور کوئی امنگ باقی نہیں رہ گئی ہے تو اس وسیع تر اکائی کیلئے ولولہ و امنگ کی عمارت کس بنیاد پر کھڑی ہو گی۔ اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم خاندان، قبیلہ اور ملک کے قدیم رشتوں پر از سر نو غور کریں اور دیکھیں کہ نئے آفاقی رشتے کی تشکیل میں ہم ان رشتوں کے کون سے عناصر اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایک کے بعد جب دوسرا نظام آتا ہے تو پہلے کے سماجی ادارے اپنی افادیت کھو دیتے ہیں، لیکن انسان کبھی کلیتہً نہیں بدلتا، چونکہ سماج افراد سے مربوط ہے اس لئے جب پیمانہ پرانی شراب سے خالی ہونے لگتا ہے اس وقت بھی تھوڑی تلچھٹ پیمانہ میں رہجاتی ہے سماجی معاملات میں یہ تلچھٹ بھی بہت اہم ہے، آج ہم اپنے بھائی کو سماجی حقوق کے معاملے میں غیر پر ترجیح نہیں دے سکتے لیکن ہم ماحول ہونے کی ہم آہنگی اور خلوص سے اسے کیوں محروم کریں، یقیناً ہم آج قبیلہ کے اس تصور کو نہیں اپنا سکتے جس کے ماتحت ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ سے بر سر پیکار رہتا تھا لیکن اس گزرے رشتے دور سے ہم زادِ راہ کے طور پر اجتماعی مسرتوں کا تحفہ لے کر آگے کیوں نہیں بڑھ سکتے۔ وطنیت جو ہوس ملک گیری میں مبتلا کرتی ہے اور جو اقتصادی استحصال کا جامہ بھی کبھی پہن سکتی ہے بری اور یقیناً بری ہے، لیکن ہم اس وطنیت سے یہ کیوں نہیں سیکھ سکتے کہ خون اور ذات کے علاوہ اور بھی رشتے مثلاً جغرافیائی

Join eBooks Telegram

لسانی، اقتصادی وغیرہ محبت کے قالب میں ڈھل سکتے ہیں اور ان سب کے اچھے نکات کو لے کر ہم رنگا رنگی کو محبوب ترین رنگ کیوں تسلیم نہیں کرتے ہم کثرت میں وحدت کا جلوہ کیوں نہیں دیکھتے؟ ہم تفرقوں کو نہیں، اختلافات کو نہیں، بلکہ مظاہر اتحاد کو کیوں نہیں اپناتے؟ مختصر یہ کہ ہم دوسروں کا حسن بھی کیوں نہیں دیکھ پاتے۔ ہم دوسروں کے لبوں پر کھیلتی ہوئی شوخ مسکراہٹوں سے اپنی روح میں لذت و شیرینی کا احساس کیوں نہیں کرتے اور ہم دوسرے کی پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو کے ایک قطرے میں اپنے غم ذات کا ارتعاش کیوں محسوس نہیں کر پاتے؟ آخر یہ آفاقی اقدار کہاں سے نہیں گے کیا آسمانوں سے اتریں گے کیا وہ ارتقائی عمل کا جری نتیجہ ہوں گے، کیا ان کے لئے ہمیں کچھ بھی محنت و مشقت نہ کرنا ہوگی اور کیا یہ ماضی سے بالکل ہی مخالف ہوں گے کیا ان میں مادی تسلسل کی کوئی علامت نہ ہوگی

انسانیت کو ترقی پسند اشتراک کے رستوں پر لے چلنے کیلئے اب بھی اہم اقدار کی ضرورت ہے، خلوص بھائی اور محبت۔ اپنے عالمی اور عملی جہات میں اب بھی بڑی حد تک قابل اخذ ہیں، خاندان ٹوٹ گیا، بکھر گیا، مگر بھائی ہم وطن تو ہے، ہم وطن بھی نہ سہی انسان تو ہے، ہم سے ہزار دوسرا اقدار میں اور اطوار میں مشترک تو ہے، پھر ہم اس سے بالکل ہی کیوں کترا جائیں، باہمی تعلقات قائم رکھنے کیلئے ہم جو ثقافتی لین دین کا طریقہ صدیوں سے بچ کر رکھا تھا وہ خندہ پیشانی سے ملنا وہ اچھی چیز کا احترام اور اچھی چیز کو متبرک سمجھنے کا جذبہ کیا ہوا؟ مانا کہ صفات انسانی ہیں تو تقدس و احترام کا جذبہ بھی اضافی سہی، لیکن ہو تو! ہم پرستش نہ کریں ہم سر نہ جھکائیں لیکن بیجا غرور اور نارواہی بے پروائی کے بھی تو مجرم نہ ہوں، یہ کیا کہ ہم انسانیت کو مساوات کو اشتراک کو، سماج کی روح تو جانتے ہیں لیکن ان کو اپنانے کیلئے جس محبت، شفقت اور احساس خوبی و احترام کی ضرورت ہے اس سے ہم عاری ہیں؟ ہم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ وطن دوستی اور انسانیت دوستی میں کمیت کا فرق زیادہ اور کیفیت کا کم ہے کم بھی میں اسی لئے کہتا ہوں کہ نظریاتی اعتبار سے کمیت کی تبدیلی بھی کیفیت کی تبدیلی ہو جاتی ہے ان دونوں میں کوئی خدا واسطے کا بیر نہیں

چونکہ تبدیلی کے عمل میں اکثر مخالفین ناگزیر ہو جاتی ہیں اس لئے مخالفت کی تلخی مادی تضاد کو بعض اوقات نفسیاتی دشمنی میں بھی تبدیل کر دیتی ہے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ سماج کا اگلا قدم ترقی کی طرف ہونا چاہیئے۔ اگر ہمیں چھوٹی موٹی رقابتیں مٹانا ہیں تو خود اپنے دل سے ان رقابتوں کے قبائلی تصور کو دور کرنا ہوگا اور ارتقائی تصور کو اپنانا ہوگا۔ ہمیں قدیم اقدار سے اس لئے کنارہ کشی کی ضرورت نہیں ہے کہ

Join eBooks Telegram

وہ قدیم ہیں۔ انسان بھی تو جدید نہیں ہے اسکی بنیادی خواہشیں کبھی تو پرانی ہیں ہمیں قدیم یا محدود اقدار کے صالح پہلوؤں کو باقی رکھتے ہوئے ان کو کائناتی اور آفاقی اقدار کا قابل تسلیم جزو قرار دینا چاہئے اگر ہم اس نقطہ کو عبوری دور کیلئے اپنا لیں تو وہ خلائے بسیط پر ہو جائیگا جو حال و مستقبل کے مابین اخلاقی اور روحانی سطح پر نظر آرہا ہے (یہاں میں نے اخلاقی اور روحانی کی اصطلاحیں مخصوص وضعی معنوں میں استعمال کی ہیں اخلاقیات و روحانیات دراصل فرد، فرد اور فرد، سماج اور فرد، کائنات کے مابین وہ رشتے ہیں جو فرد کے وجود کو سماجی معنویت اور استحکام عطا کرتے ہیں لیکن ان سے کوئی سماوی یا مابعد الطبیعیاتی تصور وابستہ نہیں کیا ہے)

مندرجہ بالا حالات میں محمد حسن کا یہ نسخہ کہاں تک کارآمد ہو سکتا ہے کہ آجکل ادیب کیلئے چار باتیں ضروری ہیں (۱) سماجی ذمہ داری کا احساس (۲) جو محسوس کرنا ہی لکھنا (۳) سنجیدہ اور ذمہ دار فکر کی آئینہ داری (۴) انداز بیان کی سادگی۔ اب آپ ہی غور فرمائیے کہ کیا یہ کوئی مسئلہ حل کرتا ہے؟ کیا یہ ایک نظر فریب ابہام سے زیادہ وقعت رکھتا ہے؟ کیا یہ شخصیت و کردار کے بحران کا علاج ہو سکتا ہے۔ ان سے کہیں زیادہ مثبت بات محمود ایاز نے کہی ہے کہ۔ انسان کا کردار مسخ ہو گیا ہے اسے ماضی کی بازیافت نہیں کرنی ہے۔ اور ماضی کی بازیافت کیلئے وہ چند مشترک بنیادی تصورات اور عقائد کو ناگزیر سمجھتے ہیں، یہ مشترک بنیادی تصورات وہی ہو سکتے ہیں جنھیں میں نے "دردِ تہ جام اخلاقیات" کہا ہے جو ارتقائی عمل کے دوران میں باقی رہجاتی ہیں یہ ماضی پرستی نہیں بلکہ کاروان ہستی کے سفر ترقی کے تسلسل کا احساس ہے اور اس کا اقرار ہے کہ اس ترقی کی دوڑ میں انسان کا مقصد ہمیشہ جماعتی منفعت میں اضافہ رہا ہے اور اسی لئے اس نے جو اخلاقی اقدار بنائے ہیں ان میں صرف وہی رد کر دینے کے قابل ہیں جو ازکار رفتہ ہو چکا ہے اور جس پر فرسودہ و مردہ نظاموں کی گہری چھاپ ہے، باقی جن میں فطری حیات کے تقاضوں کی جھلک ہے اور جنھیں ہم انجان بنکر ادھر ادھر پھینک دیتے ہیں وہی ہمارا بنیادی اثاثہ ہیں اور ان کی وساطت سے ہم نے عہد کی قدریں ابھاریں اور اجاگر کرتے گئے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اگر انہی چکا چوند میں انسان کو اس راستے سے ہٹا کر خلائے محض میں لیجانے کی کوشش کرے گی تو وہی ہماری تباہی ہو گی۔ انسان کچھ بھی ہو لیکن اسے یہ نہ بھولنا چاہئیے کہ نہ تو وہ حیوان مطلق ہے اور نہ ROBOT اس کو پابند کائنات کی مضبوط سطح پر اور اس کی نظر ان اقدار پر جو انسانی تجربوں سے ہمیں ورثہ میں ملے ہیں، ضرور رہنا چاہئیے تبھی ہمیں وہ شے نصیب ہو سکتی ہے جسے محمود ایاز مربوط فلسفۂ حیات اور نظام اخلاق کا نام دیتے ہیں، ہمارا یہ فعل رجعت پسندی اور روایت پرستی سے مختلف ہی نہیں متضاد ہے اور سر بسر ترقی۔

Join eBooks Telegram

پسندانہ ہے، کیونکہ ہم روایات کو عمل کی بنیاد نہیں بناتے بلکہ ارتقائی عمل کا ایک شاخسانہ قرار دیتے ہیں اور اس کے تمام نتائج میں سے ایک نتیجہ مانتے ہیں البتہ یہ ایسا نتیجہ ہے جس پر قدیم نتائج کی بھی چھاپ ہے دراصل روایات ہی سے ارتقا کے عمل کے تسلسل کا پتہ چلتا ہے

ان حالات میں ہمارے ادیبوں اور شاعروں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان انسانی اقدار کو مضبوطی سے پکڑیں یہی ان کی سماجی ذمہ داری ہے۔ سماج کی زبوں حالیوں کی عکاسی استحصال کے خلاف جذبہ کا ابھارنا، امن کے استحکام کی کوشش، اجتماعی مسرت و فارغ البالی کیلئے تعمیر کا جذبہ پیدا کرنا سب انھیں اقدار کے ساتھ خلوص برتنے ہی پر ممکن ہو سکے گا۔ یہی شاعر کی سماجی ذمہ داری کا احساس ہے اور اس احساس کا عملی نتیجہ اسکی ادبی تخلیقات ہمارے قدیم ناقدوں نے جہاں ہمارے ادب پہ یہ احسان کیا ہے کہ انھوں نے مسائل حیات کے تاریخی تجزیہ کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی، وہاں وہ اتنا الجھ گئے وہ اس خطرے سے بھی بے خبر ہو گئے کہ کہیں ہم خالص صحافتی قسم کے ادبی اقدار کو نہ اپنانے لگیں۔ دراصل ہم اسی قسم کے دلدل میں پھنس گئے تھے، کسان، مزدور، جنگ، سامراج، سرمایہ داری اشتراکیت وغیرہ چند بندھے ٹکے مضمون تھے جن میں ہمارے سیکڑوں ادیبوں اور شاعروں نے قافیہ پیمائی کی اور موزوں گوئی اور سستی خطابت کی داد پاتے رہے لیکن انھیں یہ سوچنے کی مہلت نہ ملی کہ یہ داد ان کے ادب پاروں کی نہیں مل رہی ہے بلکہ اس ذہنی ہم آہنگی پر مل رہی ہے جو بڑی تحریکوں میں اور مخالفت کی فضا میں بے حد اہمیت اختیار کر جاتی ہے، جب وہ وقتی حالات بدلے تو وہی ادب پارے جن پر لوگ سر دھنتے تھے اپنی گرمی کھو بیٹھے۔ ان میں کیا کمی تھی یہی کہ ان نظم پاروں یا نثر پاروں میں صرف لمحۂ گزراں کی عکاسی تھی اور ارتقاء کے عمل کی گہرائیوں میں ڈوب کر روح عصر تلاش کرنے اور اعلیٰ اقدار اخلاق و ادب کے صالح پہلوؤں کو اپنانے کی کوشش نہیں تھی۔ حصول آزادی کے بعد وہ گہما گہمی ختم ہوئی اور زندگی۔ آزادی کے ناگزیر نتیجے کے طور پر۔ تعمیر کے سنجیدہ اور ذمہ دار راستوں پر چل پڑی اگر ہمارے ہاتھ صالح روایات کا دامن ہوتا تو ہمارے قدم اس منزل پر نہ لڑکھڑاتے، مگر ہمارا نظریۂ انقلاب، ارتقائی اور مادی کم اور رومانی زیادہ تھا، اس لئے ہم چاروں شانے چت زمین پر آ رہے، کچھ تقسیم کے جلو میں بھیڑیا دھسان قسم کا جنون بھی برہنہ رقص کرنے لگا اور اس کے بعد ایٹم کی ریزہ شکنی کی دریافت نے ہمارے سامنے خطرناک امکانات لا کر رکھ دئے اس پر سراسیمگی تھی ہی کہ متوسط طبقے کی فطری زبوں حالی نے ہمیں بالکل ہی بے دست و پا کر دیا اس موقع پر اگر کوئی شے ہمیں سہارا دے سکتی تھی تو وہ انسانی اور آفاقی

Join eBooks Telegram

اقدار پر وہ یقین جو سماجی ذمہ داری کے صالح احساس ہی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے

جب اس پس منظر میں دیکھا جائے تو غم ذات میں محصوری، غزل کا احیا، ذمہ دار فکر سے فرار سب سمجھ میں آجاتا ہے۔ داخلیت، تشکیک پرستی اور غم پرستی کسی میں کوئی طرفگی نہیں رہجاتی، یہ علامات ہیں اصل مرض نہیں ہے۔ غم ذات کا پر خلوص اظہار ممنوع نہیں ہے، غزل شجرِ ممنوعہ کب ہے؟ وہ تشکیک جو ہمیں اسکے قریب لیجاتی ہے اور کائنات کے اسرار و رموز کے دروازے ہم پر کھولتی ہے، وہ بھی قابل اعتراض نہیں ہے قابل اعتراض ہے وہ اصل جہاں سے یہ بظاہر معصوم سے مظاہر مہلک بن جاتے ہیں، یہ سرچشمہ ہے ارتقاء سے مسلسل رستے رہنے والے جماعتی (اخلاقی) اقدار سے بے پروائی کا، اصل میں اسی کو ختم کرنا ہے لیکن یہ کوئی عمل منفی نہیں کہ کوئی بنائی عمارت ڈھادی جائے بلکہ یہ ایک مثبت عمل ہے جس میں ایک موجودہ چیز کا بھرپور اور عملی احساس پیدا کرانا ہے۔ جب محمد حسن ادیب کی سماجی ذمہ داری کی بات کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں صرف یہ ہوتا ہے کہ سماجی حالات کی باخبر عکاسی کی جائے لیکن عکاسی پر از خبر ہوتے ہوئے بھی ادیب کو اسکی سماجی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں کرسکتی، اس سماجی عکاسی میں اسے ان روایات کے بقا و استحکام پر بھی نظر رکھنا ہوگی جو سارے عمل کو انسانی معنویت دیتے ہیں، اسی لئے میں محمد حسن کی اس ہدایت کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا کہ جو محسوس کرنا وہی لکھنا، کیونکہ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ میں آجکل کے ادیب شاعر سے یہ توقع رکھوں گا کہ وہ جو کچھ محسوس کرے اسے اچھی طرح پرکھ بھی لے کہ اس نے جتنا اور جس طرح محسوس کرنا تھا کیا یا نہیں، اس نے جلد بازی نہیں کی یہی نہیں بلکہ کچھ لکھنے سے پہلے اسے اپنے دل سے یہ سوال کرلینا چاہیئے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں اور جس طرز پر لکھ رہا ہوں اس کا ذاتی اور جماعتی جواز بھی موجود ہے یا نہیں۔

یہ ذمہ داری صرف لکھنے والوں کی نہیں ہے بلکہ ناقدوں کی بھی ہے، یہاں میں تنقید کو ایک ایسی صنف ادب کی حیثیت سے دیکھ رہا ہوں جس کا مقصد بے مقصد نکتہ چینی نہیں بلکہ تعمیری تفتیش ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہ گیا کہ ہم ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کی فرسودہ بحثوں میں الجھیں یا تحلیل نفسیات کی جھاڑیوں میں جا چھپیں اور خلوتوں میں جھانکتے پھریں، ہمیں ادیب و شاعر کی تخلیقوں کو پرکھتے وقت اسے یہ بتانا چاہیئے کہ ان کی نظر کہاں چوک گئی ہے؟ کون پہلو اظہار سے رہ گیا ہے؟ کیا وہ اہم پہلو تھا یا نہیں تھا؟ مثلاً تشکیک اور خوف کی فضا کی عکاسی کرتے ہوئے کیا ادیب نے اپنے اس اعتقاد کو اشارۃً یا کنایۃً ظاہر کر دیا ہے کہ تشکیک خوف میں مبتلا یہ دنیا غم کے بوجھ سے مرنے نہیں پائے گی اسے باقی رہنا ہے اور اس میں اب بھی بہت کچھ محبت کرنے کے قابل

Join eBooks Telegram

ہے اس کے انفرادی اور جماعتی رشتوں میں اب بھی بڑی دلکشی اور دل آویزی ہے، اسی دنیا کو اور زیادہ مسرت سے رہنے کے قابل بنانا ہے؛ یقیناً اس میں غم ذات کی بھی گنجائش ہے لیکن اسی غم ذات کی جو سماج کی شدید غم کے پس منظر میں ابھرتا ہو۔ جب تک ہمارے غم میں اور ابنائے جنس کے غموں کا پتہ تو نہیں ملتا، ہمارا غم بدی لذتوں سے ہم آغوشی کا تصور بھی نہیں کر سکتا پھر وہ بے عملوں کا غم بن جائے۔ اپاہجوں کا نوحہ ہوگا

محمد حسن نے غزل کے احیا کی بات شخصیت و کردار کے بحران کے ثبوت میں کی ہے ہم جب غزل کے احیا کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں صرف یہ بات رہتی ہے کہ آج غزل کا رواج زیادہ اور نظم کا کم ہوگیا ہے۔ تناسب کی یہ تبدیلی کسی اتنی عظیم شے کی نمائندگی نہیں کر سکتی جیسے شخصیت اور کردار کا بحران، دونوں اصناف سخن بلیغ ہیں اور جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ غزل میں کوئی بنیادی خرابی ہے جس کا شخصیت و کردار کے بحران سے کوئی خاص تعلق ہے اس وقت تک محمد حسن کے تجزیہ کی نوعیت اس فتوے سے زیادہ نہ ہوگی جس کیلئے فقہی جواز موجود نہ ہو، ان کے ذہن میں اگر یہ بات ہے کہ غزل ہی غم ذات کا آلہ اظہار ہے تو مجھے اس سے اختلاف ہے، کیونکہ غم ذات کا اظہار، غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مخمس، مسدس، مرثیہ، سبھی اصناف سخن میں کیا جا سکتا ہے اور کیا بھی گیا ہے، اگر موجودہ غزل کو غم ذات سے مخصوص بھی کر لیا جائے تو اعتراض غم ذات پر ہوگا، غزل پر نہیں کیونکہ غزل کبھی کبھی ناسخ، اسیر، امیر، داغ، انشا وغیرہ کے ہاتھوں میں بھی کھیلی ہے اور کبھی، اقبال، سہیل، جوہر اور حسرت کے یہاں اور آج بھی، فیض، فراق، جوش، جذبی، وغیرہ کے یہاں کائناتی تصورات کو اپناتی رہی ہے اور سیاسی نظریات کو رواج دینے میں معاون بنی ہے لیکن اس کے باوجود میں محمد حسن سے اس بات میں متفق ہوں کہ نظم سے روگردانی کا موجودہ رجحان ختم ہونا چاہیئے، میں غزل کا مخالف نہیں ہوں، بلکہ غزلوں کے ایک مجموعہ کا مجرم بھی ہوں لیکن اس کے باوجود میں اقبالی مجرم ہوں کہ آج غزل سے زیادہ نظم کی ضرورت اور حاجت ہے کیونکہ غزل میں جہاں اختصار و خلوص کی بیحد صلاحیت ہے، وہاں عمومیت کی گنجائش وضاحت کے امکانات کو ختم کر دیتی ہے، غزل دراصل اس ماحول میں پنپتی ہے جب نظر افق کائنات کے بدلتے رنگوں میں سے ہر رنگ، پر پڑنے لگے اور ہر رنگ سے یکساں انبساط ملنے لگے اور نظر کسی ایک ہی نقطہ پر مرکوز ہو کر نہ رہ جائے کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ نظر ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر ہر طرف دوڑنے لگتی ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ مرکزی نقطہ خیال خود گرد و پیش نظر دوڑانے پر مجبور کرے، جیسے تصوف و عشق کہ مرکز توجہ ایک ہے لیکن اس مرکز کے متعلقات و مظاہر بے شمار ہیں، اس لئے یکرنگی کے باوجود رنگا رنگی ہے

Join eBooks Telegram

اگر غزل کی صلاحیتوں کا یہ مختصر جائزہ درست ہے تو محمد حسن کے تجزیے کے مطابق غزل کا ادب آج ہونا چاہیے کیونکہ
وہ کہتے ہیں کہ "ممکن ہے کہ ادیب اپنے عہد میں پلنے والے سارے عقیدوں اور نظریوں سے دامن بچانے پر مجبور ہو"
جب مجبوری کا یہ عالم ہو (اگرچہ میں اس سے متفق نہیں ہوں) تو غزل اس کیلئے یقیناً مناسب ہے۔ اگر یہ مجبوری نظری
ہے اور اس پر بازپرس ناروا تو غزل کی طرف جھکاؤ کیسے ناروا ہو جائے گا؟ نظم ایک تسلسل، ایک خلوص، یقین یا ایک
واضح مقصد کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی اور چونکہ میں ان خصوصیات کو آج کے دور میں ضروری سمجھتا ہوں
اس لئے میں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ نظم کی طرف توجہ زیادہ ہو، ہمارے آج کے مسائل کو پوری شدت اور
وضاحت سے بیان کرنے یا اس کا پورا احساس دلانے کیلئے غزل ایک ناتواں اور ناکافی آلہ ہے، یہ مربوط خیالات
سے بھی جھجکتی ہے، کیونکہ اپنی تنگ دامنی سے واقف ہے، نظم سے ہمارا مقصد پورا ہو سکتا ہے اگرچہ یہاں یہ
نکتہ بھی ذہن میں محفوظ کر لینا چاہئے کہ غزل میں ایک اہم خوبی بھی ہے کہ یہ اہم مسائل کے خاص خاص پہلوؤں پر
مختلف زاویوں سے بار بار روشنی ڈال سکتی ہے، اس لئے غزل کے خلاف یکطرفہ رائے اور بعض صورتوں میں معاندانہ
[illegible] کی بجائے غزل کو نظم کے معاون کی حیثیت سے استعمال کرنا چاہئے لیکن یہ انضمام اسی وقت ممکن ہے جب ہماری
نگاہیں اپنے مقصد کو واضح اور صاف طریقہ پر دیکھ رہی ہوں۔

ہمارے ادیب اور شاعر بیشتر متوسط طبقے کے افراد ہیں، ان کے موضوعات بھی ویسے ہی ہیں اگر وہ، سماج کے
فعال عنصر ہوتے تو وہ خود ہی گیت گاتے جو محنت و مشقت کی موسیقی سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن درمیانی طبقہ
سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہ لوگ کسی خلوص کے بغیر نعروں کے پیچھے بھی دوڑ سکتے ہیں، اور ان سے کنارہ کش بھی
ہو سکتے ہیں، یہ ماضی سے بغاوت بھی کر سکتے ہیں اور ماضی کے دامن میں پناہ بھی ڈھونڈ سکتے ہیں، انھیں
پہلے ان کے قدموں کو مضبوطی سے جما دینا چاہئے، یہ زمین صرف تعمیر مستقبل کی ہو سکتی ہے ایسا مستقبل جو
کسی خاص علاقہ یا ملک کو نہیں بلکہ ساری کائنات کو حاوی ہو، جو لوگ آج کے ماحول میں اپنے طبقہ کی ملی
زبوں حالی کے باعث خود ہی یاس میں گرفتار ہیں ان کو اگر یاس کے نغمے گانے کی عام اجازت دے دی گئی
تو وہ ساری فضا کو کراہوں اور چیخوں سے بھر دیں گے اور پھر کہیں گے ہم حقیقت نگاری کر رہے ہیں یا یہی کچھ
رہے ہیں جو محسوس کر رہے ہیں۔ یقیناً یہ حال کے حقائق کا اظہار کریں اور سچائی سے کریں، درد و غم و محرومی
کے گیت گائیں، لیکن وہ صرف یہ یاد بھی رکھیں کہ انھیں آگے جانا ہے، اور قدیم زمانے کی جیالوں کی طرح ہاتھ
[illegible] دبیں کر صرف روتے رہنا اور سماج کے ظلم سہنا نہیں ہے، جنگی حالت آج سنگین ہے ان کو ہمارا نغمہ

Join eBooks Telegram

سوغات

وحید اختر

ہمارے عہد کا ادبی مزاج

سوغات کے پچھلے دو شماروں میں موجودہ ادبی مسائل کے متعلق، محمد حسن، علی جواد زیدی اور باقر مہدی کے مضامین شائع ہو چکے ہیں، ویسے تو یہ مباحث نہیں ہیں مگر ان سے اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ آج ہمارے ادیب اپنی ساری سوجھ بوجھ کی ذہنی دیانت کے ساتھ ان مسائل پر غور و فکر کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں، ڈاکٹر محمد حسن کے پہلے اور دوسرے مضمون میں جو تضاد ہے اسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی انھوں نے اپنے پہلے مضمون میں معاصر ادب اور بطور خاص نئی نسل کے ادیبوں پر جو احکام لگائے تھے دوسرے مضمون میں نہ صرف انھوں نے انکے جوابات بھی خود ہی دے دیے بلکہ ان کا لب و لہجہ اور شاید انداز فکر بھی بدلا ہوا ہے اس تضاد سے کچھ ظاہر ہو نہ ہو مگر یہ بات تو کھل کر سامنے آتی ہے کہ آج تک ہمارے ناقدین نئے تقاضوں نئے رجحانات اور خود اپنے عہد کے ادبی مزاج کو سمجھ نہیں پائے ہیں اسی لئے وہ متضاد آرا اظہار کر کے نہ صرف خود الجھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی الجھاتے ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ ادب و تنقید میں غیر ذمہ داری کا سراغ ملتا ہے، جس نے ہماری تنقید کو محض قصیدہ خوانی یا محض دشنام طرازی بنا دیا ہے، اگر کوئی ناقد ان کے درمیان کوئی راہ نکالتا بھی ہے تو وہ کسی مخصوص فکری رجحان کی واضح نمائندگی کرنے کی جگہ ادبی سمجھوتہ بازی سے کام لیتا ہے جس کیلئے برعکس اصطلاح "ادبی دیانت" استعمال کی جاتی ہے، سمجھوتہ زندگی بسر کرنے میں ہو سکتا ہے اسلئے ہم جس سماج میں رہتے ہیں وہاں اگر قدم قدم پر سمجھوتہ نہ کیا جائے تو سوائے ذہنی طبع کی بلا کے سوا کچھ اور ہاتھ نہیں آ سکتا، اسی سمجھوتے کا عکس آج کی سیاست میں نظر آتا ہے، آج سیاست نے ہمارے عہد کی زندگی میں وہی جگہ لے لی ہے جو کبھی مذہب کو حاصل تھی، کہنے کو تو ہم سائنس کے بہت ترقی یافتہ دور میں سانس لے رہے ہیں، مگر آج کا انسان سائنسی فکر سے زیادہ میکانکی اور سیاسی رویے کا پابند ہے، ادب بذات خود مطلق، مذہب اور سائنس کی طرح ایک بالذات حقیقت ہے جو اپنے وجود کیلئے نہ مذہب کی تابع ہے نہ سائنس اور سیاست کی، البتہ جس طرح عمرانی علوم، فلسفوں، سیاسی نظریات اور مذہبی تصورات کا ایک دوسرے سے تعاون و تصادم ہوتا ہے اسی طرح ادب بھی انکے ساتھ تعاون و تصادم کی منزلوں سے گزرتا ہے، کوئی بھی ادب اپنے زمانے کے فلسفیانہ رجحانات، مذہبی تصورات، سائنسی ایجادات اور سیاسی خیالات سے الگ

Join eBooks Telegram

ہیں رہ سکتا لیکن "عظیم ادب" ہر حال میں ادب رہتا ہے وہ زندگی کی ہر شاخ سے تعلق رکھتے ہوئے
ان کے پیچھے نہیں چلتا۔ جو ادب معاصر رجحانات سے اثر قبول کرنے کے بعد بھی اس حد تک آزاد رہے کہ اسکی
اقدار ہر دور میں عظیم سمجھی جائیں وہی سچا اور حقیقی ادب ہے۔ فلسفہ، سائنس اور مذہب کی طرح ایک
ات اور آزاد حقیقت ہے

آج بھی جب ہم ادبی مسائل پر بحث کرنے بیٹھتے ہیں تو ادب کی اسی انفرادیت کو نظر انداز کر دیتے ہیں
ایسی اصطلاحات میں گفتگو کرتے ہیں جو بالواسطہ یا غیر شعوری طور پر ادب کو فلسفیانہ یا سیاسی اصطلاحات کی
غیر دتشریح بنا دیتی ہیں، پچھلے دنوں ترقی پسند تحریک کے متعلق جو بحث چلی اور اب تک جاری ہے، اس
میں شاید کسی کی نظر اس طرف نہیں گئی کہ ترقی پسندی اور رجعت پسندی بذات خود سیاسی اصطلاحات
ہیں ادبی نہیں، ہم کسی سیاسی نقطۂ نظر یا اپنے اضافی تصورات و عقائد کی بنا پر ترقی پسند یا رجعت پسند
ہونے کا حکم لگانے کے عادی ہیں زندگی پر سیاست کے اسی زبردست اثر اور اذہان پر سیاسی تصورات کی اسی
بے رحم گرفت کے باعث ادب میں بھی یہ اصطلاحات اپنی اضافیت اور ہنگامی قدر کے باوجود راہ پا گئی ہیں
ڈی، ایچ، لارنس یا نطشے کے خیالات و نظریات پر کوئی بھی نام نہاد ترقی پسند اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے تحت
بیباکانہ انداز میں رجعت پسندی کا فتویٰ صادر کر سکتا ہے، لیکن اس تعصب کے باوجود وہ بھی اس بات سے
انکار نہیں کر سکتا کہ یہ دونوں بڑے آرٹسٹ ہیں، جب اختلاف نظر کے بعد بھی ان دونوں ادیبوں کو بڑا
کہہ دیا جائے تو اس کا مطلب ہوگا کہ یہ بڑائی ان کے تصورات سے الگ اور ماورا کسی دوسری "قدر" کا
نتیجہ ہے، یہی بذات خود موجود اور سیاسی فلسفوں سے ماورا قدریں ادب کی خالص قدریں ہیں جنھیں آج
بھی ان کا مناسب اور موزوں مقام نہیں مل رہا ہے

اسی اصطلاح سے ملتا جلتا حال "تشکیک" کی اصطلاح کا ہو گیا ہے، جب میں نے اپنی پہلی سخن گسترانہ بات
(صبا، جولائی، اگست ۱۹۵۸ء) میں موجودہ ادبی مزاج کا تجزیہ کرنے کیلئے اس اصطلاح کا استعمال کیا
تو میرے ذہن میں یہ اصطلاح صرف فلسفے کی ایک بندھی ٹکی اصطلاح بنکر نہیں آئی تھی بلکہ میں نے تشکیک کو
مزاج کا سب سے اہم اور جاندار رجحان سمجھکر اس لفظ پر زور دیا تھا جو بعد کی بحثوں میں کثرت تعبیر سے خواب
پریشاں بنگیا، خود میں نے سجاد ظہیر کے الزامی مضمون کا جواب دیتے ہوئے اس اصطلاح کی پوری فلسفیانہ
تعبیر و تشریح کر دی تھی اور یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ تشکیک کا ایک رجحان تو فکر سے اغماض برتنے اور فرار کے

Join eBooks Telegram

مترادف ہے، مگر دوسرا مثبت رجحان ہے جو آج الوقت فلسفوں اور اقدار کو شک کی نگاہ سے اس لئے جانچتا
پرکھتا ہے کہ حقیقت کی ماہیت اور اصل تک پہنچ سکے، پھر بھی بعد میں ناقدین نے کہیں تو اسے فراری ذہنیت
کہیں آزادی کی ایسی لگن بتایا جس میں ذمہ داری کا احساس ہو، کہیں اسے مقصد کے فقدان کا نام دیا گیا اور کہیں
ذہنی بے راہ روی اور کم مائیگی کا جامہ پہنایا گیا، حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اصطلاح کی پوری جہتوں
پر غور کیا جاتا۔ اپنے ادب کے اشتراکی ناقدین کی طرح میں یہ ماننے کے لئے مطلقاً تیار نہیں ہوں کہ آج ہمارے ذہنی
افقوں پر ہر چیز اس لئے واضح اور صاف اور روشن ہے کہ مشرق و مغرب کے کناروں سے سرخ سویرا جھانک رہا
ہے، "سرخ سویرا" اس عہد کی دوسری پرچھائیوں کی طرح ایک حقیقت ہو سکتا ہے۔ لیکن عالمی فکر اور معاصر
رجحان کے ذہنی افق پر جو دوسری پرچھائیاں ایک دوسرے سے گڈمڈ ہیں ان کو نہ مٹا سکتا ہے نہ روشن پیکر عطا کر سکتا ہے
آج ہمارے مسائل اس قدر الجھے ہوئے ہیں کہ ان کا احصا اور احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ بیس پچیس برس پہلے
کے ادب میں مسائل کی نوعیت اور رخ بہت ہی واضح تھا۔ آج کے مسائل اور گزرے ہوئے کل کے مسائل میں
وہی فرق ہے جو ریل کے انجن اور اسپتنک کی مشینوں میں فرق ہے، آج کے مسائل اسی تناسب سے زیادہ پیچیدہ ہوتے
جا رہے ہیں جس تناسب سے میکانکی ایجادوں کی پیچیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کرے گا
کہ زرعی نظام کی سیدھی سادی زندگی صنعتی اور مشینی دور کی زندگی میں داخل ہو کر نئی الجھنوں نئے مسائل
اور نئی پیچیدگیوں سے دوچار ہو گئی ہے، اس صدی کے آغاز سے ہی نفسیات کے مختلف مکاتب خیال نے جن
نفسی مسائل کو چھیڑا اور دریافت کیا ہے وہ آج سے چند صدی پہلے نہ صرف یہ کہ علم کے احاطے سے خارج تھے
بلکہ بڑی حد تک حقیقت میں بھی ان کا کوئی وجود نہ تھا لیکن آج وہی الجھنیں حقیقت بنی ہیں، آج کا نوجوان
سماج میں جن جنسی ناآسودگی، جس جسمانی تشنگی، جس روحانی کرب اور ذہنی الجھنوں سے گزر رہا ہے وہ ہمارے
بزرگوں کو درپیش آئی تھیں نہ وہ ان کو سمجھ سکتے ہیں۔ جب اس خارجی حقیقت کا زندگی میں ایک وجود ہے
تو کیسے مان لیا جائے کہ آج کے فکری اور ادبی رجحانات میں ان کا عمل دخل نہ ہوگا، ہم سے دو چار نسل پہلے تک
ہمارے اسلاف جاگیردارانہ سماج کی جن قدروں کو مانتے اور ان کے سہارے زندگی گزارتے تھے جن پر بھی
اعتماد پر تکیہ کرتے تھے آج وہ اگر ختم نہیں ہوئی ہیں تو کم از کم شکست و ریخت کی منزلوں سے ضرور گزر رہی ہیں ایک
سماج ٹوٹ گیا، اس کے ساتھ اس کی بہت سی سماجی، معاشی اور روحانی قدریں بھی مٹ گئیں۔ نیا سماج بنا،
نہیں بن رہا ہے، چاروں طرف انتشار، تذبذب اور تشکیک ہے، نئی قدریں ابھی پوری طرح ظاہر نہیں ہوئی ہیں

Join eBooks Telegram

اور اگر جنم لے بھی چکی ہیں تو ان میں وہ توانائی نہیں کہ روحانی اور ذہنی زندگی کو سہارا دے سکیں۔ قدروں
کے اس تبادلے اور آمد و رفت کے عبوری دور میں اب یہ مشکل ہے کہ ہم کسی بھی بات پر آنکھیں بند کرکے
ایمان لے آئیں۔ ترقی پسند تحریک نے مذہب کی جگہ مارکسزم کا عقیدہ دیا اور اس پر ایمان بالغیب لانے کی
شرط رکھی گئی۔ آج بہت سے پرانے ادیب بھی اس زمین کو کھو چکے ہیں جس پر وہ کل تک کھڑے تھے۔ ہنگری کا
ہنگامہ، پاسترناک کی کتاب پر رد و قدح، اسٹالین کے بت کا ٹوٹنا، روس اور چین کی آئے دن کی تبدیلیاں
اگر اعتقاد چھین نہ لیں تو بھی یقین کو تو متزلزل کرتی ہی ہیں اس طرح ہماری پچھلی نسل نے مذہب ردھا
کی جگہ جس فلسفہ کو اپنایا تھا آج وہ بھی ہم کو اسی یقین کے ساتھ ورثے میں نہیں دے سکتے۔ آج ادیبوں کے
سامنے کوئی مشترکہ مقصد نہیں ہے۔ آزادی حاصل کرنی تھی سو کر لی، اس وقت ہمارا مقابلہ بیرونی سامراج
سے نہیں اپنے سماج کے اندر تبدیلیاں لانی ہیں ہم کو اپنے کلچر اور آرٹ کی از سر نو تعمیر و تشکیل کرنا ہے، اس
منزل پر اگر خیالات میں اختلاف ہو تو یہ کسی انحطاط کی نشانی نہیں اسی تنوع اور اختلاف سے ہمارے کلچر کی
رنگارنگی عبارت ہے، خاص طور پر آرٹ کبھی اجتماعی ذہن کی پیداوار نہیں ہوتا وہ اجتماعی تہذیب کے تقاضوں
اور حاجات کو پورا ضرور کرتا ہے مگر ہوتا ہے انفرادی ذہن ہی کی پیداوار، کوئی سیاسی پارٹی، کوئی سماجی
گروہ، کوئی ادبی ادارہ، کوئی ثقافتی انجمن، ادب اور آرٹ کی تخلیق نہیں کرتی، یہ ادارے عام ادب کی
تشہیر و اشاعت میں تو مدد دیتے ہیں مگر وہ آرٹسٹ کو اپنا پابند بنا کر قلم پکڑوا کر اس سے لکھوا نہیں سکتے
اس کیلئے ادیب کو پہلے اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کرنی پڑتی ہے، اپنی انفرادیت بنانی پڑتی ہے، اور
چونکہ انفرادی تجربے اور تخلیق سے عبارت ہے اسلئے اسے محض اسلئے ہدف ملامت نہیں بنایا جا سکتا کہ
انفرادیت پسندی کا رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ترقی پسند تحریک نے ادیبوں سے یہی انفرادیت چھین لی
تھی، اگر آج نئی نسل کے ادیب شاعر اسی انفرادیت کو بنا رہے ہیں تو یہ اچھا فال ہے۔ سب ادیب مل
کر ایک ہی کورس کیوں گائیں، ایک ہی نعرہ کیوں لگائیں، ہر فرد سماج میں رہتے ہوئے، معاصر رجحانات
سے اثر قبول کرتے ہوئے بھی اپنے ذہنی اور جذباتی مسائل میں دوسروں سے الگ رہتا ہے، یہی انفرادیت ہے اس لیے
اس انفرادیت کو چھیننے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک فرد کو قتل کرکے بےجان اور محض مشین بنا دیا جائے، انفرادیت
کے تحفظ کے ساتھ اگر آج غم ذات، غم دوراں اور جاناں کا مرکز بنگیا ہے تو اس کا مطلب مطلقاً نہیں کہ
آج کا ادیب اپنی ذات کے خول میں بند ہے وہ حیات و کائنات کے مسائل کو دیکھتا اور سمجھتا ہی نہیں

Join eBooks Telegram

بلکہ ان کا تجربہ کرتا اور انھیں محسوس کرتا ہے، اپنی ذات کو ان کی آگ سے گزار کر تپاتا اور پختہ کرتا ہے اس تپاؤ
اور پختگی رچاؤ اور بساؤ کے عمل کے بعد ادیب کا غم ذات ایک فرد کا غم ذات نہیں رہتا ہے بلکہ وہ اپنے عصر کی
روح کے کرب اور تقاضوں کا ترجمان بن جاتا ہے اس کرب کا اظہار اس رجحان کی ترجمانی کا انداز ہر ادیب
کے انفرادی اسلوب، تجربے اور زاویہ فکر کے لحاظ سے جدا جدا ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ساز کے مختلف سُروں کی طرح
ہم آہنگ ہوتا ہے، ہمارے پرانے ناقدین اس بات پر افسوس نہ کریں کہ اجتماعی مقصد اور اجتماعی شعور کے فقدان
نے آج کے ادیبوں کو ایک بڑی دولت سے محروم کر دیا ہے وہ لوگ جس چیز کو اجتماعی مقصد و شعور کہتے ہیں وہ در
اصل ادیب پر لادی ہوئی مصنوعی چیز ہے جو صرف لباس ہے، روح نہیں۔ اگر ادیب اپنی شخصیت کے ساتھ
ایماندار ہے، اپنی انفرادی زندگی اور تجربوں کے ساتھ مخلص ہے تو وہ کبھی بھی اپنے عہد کے مطالبات سے دامن بچا
سکتا ہے نہ آنکھ چرا سکتا ہے

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے پہلے مضمون میں مارکسی نقطہ نظر او فکر کو ہمارے ادبی تقاضوں اور زندگی کے مسائل کا
واحد اور مجرب نسخہ بتایا تھا جسے "ھوالشافی" لکھ کر استعمال کرنے سے شاید بہتوں کو افاقہ ہو، مگر بعضوں
کے مرض میں افاقہ نہیں ہو سکتا جس طرح نیم حکیم طبائع کا لحاظ کئے بغیر ہر مریض کو ایک ہی نسخہ دیکر خطرہ جان
بن جاتے ہیں، اسی طرح تنقید و ادب میں ایک ہی فارمولے کو ہر جگہ طبائع اور انفرادی میلانات کا خیال
کئے بغیر استعمال کرنے سے ادب کی زندگی پر بھی بن جا سکتی ہے، غالب اور شیکسپیر ڈانٹے اور گوئٹے، حافظ اور
شیلر، ملٹن اور میر، کالیداس اور اقبال اپنے دور ہی کے نہیں ہر دور کے بڑے فنکار ہیں لیکن ان کی عظمت اسی
میں ہے کہ انھوں نے اپنے معاصر ادبی مزاج کے ساتھ انصاف کیا، آج ہم کسی ادیب، نوعمر یا کہنہ سال سے یہ فرمائش
نہیں کر سکتے کہ وہ ان عظیم کلاسیکی فنکاروں کی آواز بازگشت بن جائے، تخلیق اور عظمت بازگشت میں نہیں نئی
آواز کی توانائیوں میں ہے، ہمارے جو ناقدین اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ آج کے دور میں کوئی غالب
یا میر یا اقبال کیوں نہیں پیدا ہوتا وہ ادب و تخلیق کے راز سے نامحرم ہونے کا ثبوت دیتے ہیں کیونکہ آج تو
وہی ادیب پیدا ہو سکتے ہیں جو اس وقت لکھ رہے ہیں، شخصیتوں کے بننے اور انفرادیت کی تشکیل میں عمریں
لگتی ہیں تنقید کے ضابطے گڑھنا اور انھیں تخلیقی ادب پر منطبق کر دینا تو بڑا ہی آسان کام ہے، لیکن تخلیق کے
ساتھ انصاف کرنا اور فنکار کے مزاج کو سمجھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، یہاں فرہاد کو شیریں کے فراق میں تیشے سے
سر پھوڑنا پڑتا ہے اور شاید ہمارے معاصر ادب میں اس بات کی سب سے بڑی کمی ہے کہ ہمارے ساتھ شاعروں

Join eBooks Telegram

اور تخلیقی فنکاروں کا تو جلوس ہے مگر ایسے ناقد نہیں ہیں جو اپنی تنقید کو تخلیق سے ہم آہنگ کر کے خود اسے تخلیقی عمل بنا دیں، شاید یہ کام بھی شاعروں اور افسانہ نویسوں کو خود انجام دینا پڑے گا

ابھی ابھی ہم اردو ادب کے جس دور سے گزر کر ایک نئے دور کی طرف بڑھے ہیں، اس میں حابی فارمولوں اور ضابطوں، سیاسی نعروں اور نام نہاد اجتماعی مقاصد اور ان کے مصنوعی شعور پر ہی بہت زور دیا جاتا رہا ہے، ہمارے ناقد اسی دور کے ناقد ہیں اس لئے وہ آج کے ادب پر بھی انہی فارمولوں کی عینک سے نظر ڈالنے کے عادی ہیں اگر ہم سوشلزم کو بھی آج سماجی تعمیر و تشکیل کا واحد راستہ مان لیں تب بھی یہ سوال باقی ہی رہتا ہے کہ کون سا اشتراکی سماج لینن و اسٹالین کا، ماؤزے تنگ کا، کروشچیف کا، چو این لائی اور لیو شاؤ چی کا UTOPIAN SOCIALISM والوں کا، اچاریہ کرپلانی جے پرکاش نارائن اور اشوک مہتا کا، ٹیٹو کا، لوہیا کا یا نہرو کا؟ — آخر کون سا سماج ہمارا راستہ اور پھر منزل بن سکتا ہے، سوشلزم جو شاید کبھی ایک مطلق نقطۂ نظر رہا ہو اب کثرتِ تعبیر و اطلاق سے خود ایک اضافی اصطلاح بن چکا ہے، اسی لئے اضافی اصطلاحات کے ابہام کے دلدل میں چلنے کی بجائے اگر ادب میں کوئی سیدھا، واضح اور صاف راستہ اختیار کیا جائے تو تازہ و قدیم واردانِ بساطِ ادب کیلئے بھی مفید ہوگا اور ادب کیلئے بھی شفا بخش، یہ راستہ وہی ہے جس پر چل کر معاصر عہد کے تمام تقاضے اور رجحانات سامنے آئیں۔ ایک رجحان پر ضرورت سے زیادہ زور دے کر، دوسرے رجحانات کی نفی کرنا پھر اسی دلدل میں گرنے کے مترادف ہے، جہاں پہونچکر آگے کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں، راستوں کا مسدود ہو جانا ذہن کی کھڑکیوں کو بند کر کے تازہ ہواؤں کی آمد و رفت کو روک دینا، اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے صرف ایک ہی تصور کو مرکز بنا کر مراقبہ کرنا بذاتِ خود حقیقت سے فرار اور معاصر ذمہ داریوں سے بچنے کا سہل پسند طریقہ ہے، اسی سہل پسند ادعائیت کے برخلاف کھلا ہوا ذہن واضح راہ تمام نقطوں کی نشاندہی کرے، تمام راستوں کے پیچ و خم سمجھائے، تمام منزلوں کی اضافت، فکر و نظر پر واضح کرے، صحتمند اور مثبت تشکیک کا راستہ ہے جو نہ ذہنی بے مائیگی و آوارگی ہے نہ غیر ذمہ داری و فرار بلکہ ہمارے دور کا سب سے اہم تقاضہ اور سب سے زندہ رجحان ہے، یونان کے ابتدائی فلسفیوں سے ہی نہیں بلکہ ڈیکارٹ (DESCARTES) تک نے فلسفۂ جدید کی بنیاد شک پر رکھی، ہماری عالمی تہذیب و فکر کے تمام ہم بالشان نظاماتِ فکر و فلسفہ شک کی اسی ایک اینٹ پر کھڑے ہیں جو الف لیلہ کے کسی منچلے شہزادے کی طرح نئی دنیاؤں کی تلاش میں صعوبتیں سہتے اپنی محبوب کو کھوتے اور پاتے زندگی کے تجربے سمیٹے جو

Join eBooks Telegram

بالآخر منزل تک پہونچے ہیں۔ ہم اس بات پر کیوں اصرار کریں کہ ہمیں کوئی منزل مل ہی جائے، انسانی تاریخ میں ایک دو نسلوں کی کھوج اور جستجو ہی منزل تک پہونچنے کیلئے کافی نہیں ہے، ہم اگر منزل تک نہ پہونچیں تو بھی آئندہ نسلوں کیلئے نئی راہوں کے نشانات تو چھوڑ ہی سکتے ہیں جو انہی راستوں سے آگے بڑھکر کبھی نہ کبھی کسی منزل کا سراغ پا ہی لیں گی، آج کا ادیب یا مفکر اپنی انفرادی شخصیت میں الف لیلہ کا کولمبس صفت شہزادہ نہیں بلکہ مجموعی حیثیت سے وہ ذہن اور وہ آرٹ کولمبس ہے جو ہم کو ورثے میں اچھے اور برے اذہان سے ملتا ہے اور جسے ہم آئندہ نسلوں کیلئے تھوڑے بہت اضافے کے ساتھ سونپ جاتے ہیں، یہی جستجو نئے افقوں کی یہی تلاش فکر و ذہن کی تسکین و نجات کی یہی تشنہ کوشش میرے نزدیک اپنی پوری مثبت معنویت کے ساتھ تشکیک ہے،

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسان کو روزگار چاہئے آزادیٔ فکر اور انفرادیت کی تعمیر کا حق چاہئے اس کے ساتھ اپنے کلچر اور ذہنی روایات کی تشکیل کا حق چاہئے ہم تشکیک کا جواز صرف وہاں پیدا کرتے ہیں جہاں ذہن پر مہر ثبت کرکے ان بنیادی، انسانی، فکری اور ادبی حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کی جائے ترقی پسند تحریک نے ہمیں چاہے جو بھی دیا ہو، ہمارے ادب میں چاہے کتنا ہی گراں قدر اضافہ کیا ہو خواہ کتنی ہی نئی راہوں اور منزلوں کی طرف رہبری کی ہو مگر اس نے وقتاً فوقتاً ذہنوں پر مہر لگانے کی سیاسی رجعت پسندی کی سعی بھی کی ہے، اسی لئے آج یہ سوچنا پڑ رہا ہے کہ اب ادب میں اس قسم کے کسی نام کی ضرورت نہیں جو ادب میں تخلیق، فکر اور اظہار خیالات کے زندہ سرچشموں پر سیاسی نقاد نظر اور نعروں کی بھاری سلیں رکھکر اور ان کے تازہ اور حیات بخش پانی سے ذہنوں کو محروم رکھے

ہمارے ادب میں ترقی پسندی اگر یہ بجائے خود کوئی ادبی رجحان مانا جائے ہر دور میں رہی ہے، میر سے غالب تک اور پھر اقبال و پریم چند تک جو ادب میں سیاسی اصطلاحات کو واضح طور پر استعمال کرنے لگے تھے ایک مثبت فکری رجحان ایسا رہا ہے جو کلچر کے تحفظ و بقا، ذہن کی ترقی و تربیت، فکر کی جدید تعمیر و تشکیل ابھرتی ہوئی نئی قوتوں کی پشت پناہی کرتا رہا چند خاص سیاسی مقاصد کے ساتھ چند نوجوان نے سنہ ۱۹۳۶ء میں جس تحریک کو ترقی پسند کے اضافی نام سے ادب میں روشناس کیا وہ ہمہ گیر قوت بنا یا وہ ادبی سے زیادہ سیاسی تحریک تھی۔ ادب ہر دور میں اپنے رجحانات سے اثر قبول کرتا ہے مگر ادب میں یہ پہلی شعوری اجتماعی کوشش تھی جس نے چند مقاصد کیلئے ادب کو آلۂ کار بنایا، وہ اچھے مقاصد ہندستان کی آزادی کے حصول اور عوام کی فلاح و بہبود معاشی و سماجی ترقی کی جد و جہد سے عبارت تھے اس جد و جہد میں ادیبوں نے اپنا حق

Join eBooks Telegram

اسی ایمانداری سے ادا کیا، جس ایمانداری سے مخلص سیاسی کارکن اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوئے ایک اور بڑا اہم مقصد حاصل ہو گیا آزادی نے ہمارے تیرہ خانے میں نئے چراغ جلائے، ملک میں آزادانہ طور پر نئے سماج کی تعمیر کا عہد اب آیا ہے۔ جس میں کلچر اور آرٹ کی دوسری شاخوں کی طرح ادب پر بھی پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ معاصر رجحانات کی آبیاری کرے ساتھ ہی ہم استحصال اور غلامی کے دور میں ماضی کی جن جاندار اور صحتمند روایتوں سے اپنا رشتہ توڑ چکے تھے انھیں پھر سے استوار کریں اس لئے کہ جس حال کا کوئی ماضی نہ ہو اس کا کوئی مستقبل بھی نہیں بن سکتا، اس منزل پر ترقی پسند تحریک اپنے تنگ سیاسی دائرۂ فکر و عمل کے ساتھ یہ کام انجام نہیں دے سکتی اس کے لئے زیادہ وسیع النظری کی ضرورت ہے، یہاں صرف تخریب ہی نہیں تعمیر بھی پیش نظر ہے

ہم نے بیرونی کلچر، غیر ملکی فلسفے اور نظریات کی بہت سی قدریں اس طرح درآمد کر لی ہیں جیسے بدیشی کپڑا باہر سے منگا کر پہن لیا جائے، کلچر، آرٹ اور ادب صرف لباس نہیں وہ روح بھی ہیں، نہ انھیں درآمد کیا جا سکتا ہے نہ برآمد، یہ شاید سرمایہ دارانہ دور انحطاط کی سب سے بڑی لعنت ہے کہ آج کلچر بھی اپنا آزادانہ اور بالذات وجود کھو کر بدیشیوں سے منگائے ہوئے لباس پہن کر یوں گھوم رہا ہے جیسے پردے پر فلم کی پرچھائیاں حرکت کرتی ہیں، بولتی ہیں، ہنستی ہیں روتی ہیں، نفرت اور محبت کرتی ہیں، لڑتی اور سمجھوتہ کرتی ہیں، جیتی اور مرتی ہیں مگر یہ سب کچھ بے روح پرچھائیوں کا کھیل ہے، اسی طرح اگر کلچر، آرٹ اور ادب بھی درآمد شدہ نظریات کی بنیاد پر کھڑے ہوں تو وہ بے روح پرچھائیاں بن جاتے ہیں، ہر وجود انسانی کو اس بات کا حق ہے کہ وہ آزادانہ طور پر غور و فکر کرے۔ اور اپنے عہد کا کلچر اختیار کرے، کوئی کلچر اوپر سے نہیں لادا جاتا وہ اپنے دور کے تقاضوں اور ضروریات کی پیداوار ہوتا ہے، آج ہمارے ملک میں وہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ جو بزعم خود کلچر، آرٹ اور ادب کا دلدادہ و سرپرست ہے اسی مصنوعی کلچر کے لبادے اوڑھ کر مستعار نظریات اور مصنوعی قدروں کی بیساکھیوں کے سہارے چل رہا ہے، ایسے ماحول میں نہ صحیح ادبی ذوق کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے نہ معاصر ادبی مزاج کیلئے تحسین سخن شناس کی امید ہو سکتی ہے، پرچھائیوں سے تو صرف میکانکی طرز عمل ہی کی توقع ہو سکتی ہے، ان سے، اس سے زیادہ مانگنا فضول ہے، ذہن دل اور جذبہ و فکر کے تقاضوں کی تشفی تو وہ زندہ جیتے جاگتے انسان کر سکتے ہیں جنکو ماضی سے وراثت میں زندہ اور حقیقی کلچر ملا ہو اور جو اپنے فعال ذہن متحرک فکر و تخیل اور زندہ جذبہ و احساس کی دولت سے معاصر عہد کی آبیاری کر رہے ہوں، اگر یہ اذہان

Join eBooks Telegram

تشکیک کا حق مانگیں تو اس پر اعتراض کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ ہم اپنی مصنوعی قدروں، درآمد شدہ فکری پیرہنوں
اور بیمار سماجی معیاروں کے آسیبوں کو ادب آزاد رہنے کا حق دے رہے ہیں

ترقی پسند تنظیم کا ہر نیا منشور ایک طرف تو ہمیشہ کلچر اور آزادیٔ فکر کے بلند بانگ دعوے کرتا ہے، دوسری
طرف وہ اپنے حدود کو اتنا تنگ کر لیتا ہے کہ عوامی دور اور NEW AGE صرف انجمن ترقی پسند مصنفین
کے نئے منشور ہی کو اپنے صفحات کی زینت بناتے ہیں اور دوسری ادبی تنظیموں (مثلاً علی گڑھ کی انجمن
مصنفین) کے منشور وہاں بار نہیں پاتے، اس طرح پھر پھر کر انجمن ترقی پسند مصنفین صرف ایک سیاسی
پارٹی کے دامن سے بندھ جاتی ہے۔ اس طرز عمل سے پھر وہی خطرہ پیدا ہوتا ہے جو بھیمڑی کانفرنس کے
انتہا پسند منشور کے بعد ادب میں سیاست کے غیر ضروری دخل نے پیدا کر دیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ترقی
پسند مصنفین کی یہ نئی تنظیم اپنے نئے منشور کی پیغمبرانہ بشارتوں اور معاہدوں کے باوجود آج کے مزاج کے
ساتھ انصاف نہیں کر سکتی، آج کا مزاج جو نہ صرف تشکیک سے عبارت ہے بلکہ اس سے بھی پریشان
ہے کہ ہمارے پیروں کے نیچے کوئی زمین نہیں صرف خلا ہے، ہماری اقدار یا تو ہمارے ہی معاشرے کے بیمار
اور مردہ آسیب ہیں یا پھر برآمد کردہ مصنوعی بدیسی پیرہن، ہم کو اپنے پیروں تلے زمین بھی ڈھونڈنی
ہے اور مثبت نقطۂ نظر کے ساتھ صحت مند اقدار و روایات کی تلاش میں ایک طرف ماضی کے دفینوں
کو کھوجنا ہے، دوسری طرف حال کے سینے کو چیر کر روشنی کی وہ کرنیں کھوجنی ہیں جو کل کا عہد بن سکتی ہیں
تشکیک کے ساتھ ہم لاادریت (AGNOSTICISM) اور اثباتیت (POSITIVISM) کی مربوط
اصطلاحات سے بھی دوچار ہوتے ہیں ان اصطلاحات کی بنیاد اس پر ہے کہ جو کچھ ہمارے حواس محسوس کرتے ہیں
وہی حقیقت ہے، اس کے آگے کوئی حقیقت اگر ہے بھی تو ہمارے ادراک و فہم سے ماورا ہے۔ اس لئے اس کی
بحثیں چھوڑ کر ہمیں صرف اسی خارجی دنیا اور اس کے حقائق کے علم و فہم تک محدود رہنا چاہئے جو ہماری
گرفت میں ہے۔ مگر فلسفے کا یہ رجحان جسے مثبت کہا جاتا ہے در اصل منفی (NEGATIVE) رجحان ہے
کیونکہ یہ ان حقائق وجود کی نفی کر کے اپنے نظام کی بنیاد رکھتا ہے جن کے متعلق اس کا ادعا ہے کہ اگر وہ ہے بھی تو ہماری
رسائی سے باہر ہے۔ اسی لئے میں ان دونوں رجحانات کو "منفیت" (NEGATIVISM) سے تعبیر کرتا
ہوں۔ اسی بظاہر مثبت اور بباطن منفی رجحان نے بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہمارے تمام موجودہ عمرانی علوم
اور طبعی سائنسوں کی بنیاد رکھی، اس طرح ہماری شروع ہی سے ماورائے مادہ تجربات، حقائق اور اقدار سے

Join eBooks Telegram

محروم ہو گئی ہو روحانی اقدار سے محروم ہونے کے مترادف ہے۔ مادیت پر خواہ کتنا ہی زور دیا جائے، مادے کو، کائنات کا واحد حقیقی مظہر اور علت اول و آخر نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ خاص طور پر ایک آرٹسٹ تخلیقی تجربے میں جن منزلوں سے گزرتا ہے ان میں شعوری شخصیت، لاشعوری تجربات سے ایسے غیر محسوس اور نامعلوم طریقوں سے گزرتی ہے جنہیں خالص مادی نہیں مانا جا سکتا۔ مغربی علوم اور سائنسوں کے اس روحانی عنصر کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہوا کہ مغرب کا کلچر ایک حد تک روحانی اقدار سے ناآشنا ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مذہب اور فلسفے کے روپ میں یہ اقدار باقی رہیں مگر ان کی موجودگی بھی بڑی مصنوعی اور غیر حقیقی محسوس ہوتی ہے۔ اتنی تعلیم و فکر کے نام سے ہمارے ملک میں جو کلچر آیا اور جسے ہم نے بہت کچھ سمجھ کر صرف منفی انداز فکر یا پختہ ذہنی، ادھوری تعلیم، مصنوعی آرٹ پرستی اور جھوٹی تہذیب دی وہ اسی یکطرفہ مغربی اثر کا نتیجہ تھا۔ اسی طرح ہمارے معاشرے کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی اپنی بڑی بڑی ڈگریوں اور بڑے وسیع اور ہمہ گیر مطالعے کے باوجود اس ذہنی اور روحانی تربیت سے محروم ہو گیا جس سے کسی ملک، قوم یا عہد کا مزاج اور کلچر بنتا ہے۔ اسی لیے ہم نہ اپنے قدیم ایسے کلچر میں سانس لے رہے ہیں جس کا وجود خلا میں ہے جس کے پیروں تلے زمین ہے نہ سروں پر کوئی وسیع اور روشن آسمان، اس کے آگے اور پیچھے نیچے اور اوپر دم گھونٹ دینے والی خلا کا بے کراں اندھیرا ہے۔ اب تک ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں یہ فیشن رہا ہے کہ وہ اپنے قومی اور تہذیبی ورثے کو نظر حقارت سے دیکھنے اور مغربی ہنرمندوں کو ہالی ووڈ کے بنے ہوئے لباسوں کی طرح سینے سے لگانے پر ہی فخر کرتا تھا۔ اب یہ رجحان کم ہو رہا ہے مگر جب لوگوں کی تعلیم و تربیت ایسے مصنوعی ماحول میں ہوئی ہے ان کے ذہنوں کو وہ توانائی اور زندگی اتنی جلد کیسے مل سکتی ہے جو زندہ کلچر اور آرٹ کو نصیب ہیں۔ اسی لیے اقدار کا ایک خلا پیدا ہوا۔ اقدار سے مراد یہاں وہ سماجی، اخلاقی اور مذہبی اقدار نہیں جو ذہن کو ذہن سے جدا، انسان کو انسان سے متنفر اور بیزار کر کے بے جان پر قربان کرتی ہیں، ایک طرف تو ہمارے نقاد اس سماج کو بدلنے کی جد و جہد کے خواب دیکھتے ہیں اور دوسری طرف وہ ادیبوں، فنکاروں، دانشوروں، مفکروں اور خلاق ذہنوں پر فیصلے صادر کرتے ہیں تو انہی بیمار، غیر حرکت مند اور مصنوعی اقدار کا سہارا لیتے ہیں جن کو وہ خود مٹانا چاہتے ہیں۔ عمل اور فکر، نظر اور فکر کا یہ تضاد اس بات کی علامت ہے کہ ان لوگوں کو بھی جو اپنے معاشرے سے مطمئن نہیں کوئی اور راہ نظر نہیں آتی تو وہ چکر لگا کر اسی محدود دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے نکلنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ ہمارے عہد کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ ہم نہ صرف اس تنگ دل، دم گھونٹ کر ہلاک کر دینے والے دائرے سے باہر نکلیں بلکہ آگے بڑھ کر تحقیق و جستجو کے نئے افق

Join eBooks Telegram

بھی ڈھونڈیں جو ہماری نظروں کے سامنے ہیں مگر ہمیں نظر نہیں آتے ـــــ اور اگر نظر بھی آئیں تو ہم سہل پسندی یا کسی تعصب کی وجہ سے ان کو صرف دھوکہ، ذہنی بے راہ روی اور فراریت کے بے معنے نام دے دیتے ہیں

"سوغات" میں چھپنے والے تمام مضامین سے زیادہ نئے عہد کے مزاج کا صحیح اور بھرپور تجزیہ مجھے، انتظار حسین کے مضمون "اجتماعی تہذیب اور افسانہ" (نیا دور شمارہ ۱۵-۱۸) میں ملا۔ اس مضمون سے کم از کم اتنا ظاہر ہوتا ہے کہ آج اردو کے زندہ اور جاگتے ہوئے ادیب اپنے دور کی خرابی، کمی اور بے یقینی کو سمجھ کر ماضی سے بھی رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں۔ ادب تجارتی اشتہار نہیں ہے جو لوگوں کو چونکانے کیلئے ہر صبح اپنی سرخی بدل دے۔ اسی لئے وہ کسی بھی سیاسی پارٹی کے منشور اور پروگرام کے ساتھ ہر پانچویں سال انتخاب لڑنے اور وقتی مصلحتوں سے سمجھوتہ کرنے کیلئے اپنا چولا نہیں بدل سکتا۔ ادب میں سیاسی اور تجارتی اشتہار بازی کا رواج عام ہو چکا ہے جسے ترقی پسندی کہئے یا رجعت پسندی (اور اسی اشتہار بازی پر ہمارے بہت سے ادیبوں کی شہرت اور زندگی کا انحصار ہے) ادب اشتہار بازی اس لئے نہیں ہے کہ اشتہار ہمیشہ صرف کسی ایک چیز پر ضرورت سے زیادہ غیر فطری، مصنوعی اور نمائشی اصرار کرتا ہے اور ادب زندگی کے ہر پہلو کو جانچتا اور من حیث المجموع دیکھتا ہے۔ ادب سیاست نہیں ہے، اس لئے کہ ادب کا رشتہ ماضی حال اور مستقبل تینوں سے ظاہر ہوتا ہے صرف وقتی نعرے اور ہنگامی مسائل اس کے پیش نظر نہیں ہوتے، ادب مذہب نہیں ہے اس لئے کہ وہ بے جان اور اندھی ادعائیت کا نام نہیں، غور و فکر اور آزادئ مثبت فکر سے بنتا ہے، خواہ یہ فکر زندہ و فعال ادعائی نظام فکر پر مبنی ہو یا تشکیکی رجحان پر۔ ادب فلسفہ نہیں ہے، اس لئے کہ ادب فکر و خیال کے ساتھ تصور اور جذبے کو بھی اپنے جلو میں لے کر چلتا ہے، ادب سائنس نہیں، اس لئے کہ وہ زندگی کے صرف کسی ایک CROSS SECTION کو نہیں دیکھتا بلکہ اسے زمان و مکاں کی پوری وسعتوں میں رکھ دیتا ہے

پھر بھی ادب فلسفے، سائنس، مذہب، سیاست سب سے ناتے جوڑے رہتا ہے، مگر ہر ایک کو اتنا ہی حق دیتا ہے، جتنا اسے ملنا چاہیئے آج ادب کی اسی تطہیر کی ضرورت ہے (لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطہرکم تطہیرا) آج اہل البیتِ ادب اسی تطہیر کا مطالبہ کر رہے ہیں جو تطہیر کا حق ہے۔ یہ تطہیر اشتہار بازی کی ذہنیت اور مسلط کئے ہوئے سیاسی پروگراموں اور فلسفوں سے نجات چاہتی ہے

ادب کی تطہیر کے علاوہ آج کے عہد کا ایک اور مطالبہ بھی ہے جو کم اہم نہیں ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اپنے ماضی کے کلچر سے اپنا وہ رشتہ جوڑیں جو ٹوٹ گیا ہے اور ٹوٹتا جا رہا ہے، یہاں میری مراد بت پرستوں کے مذہبی نظاموں

(سلسلے کیلئے ملاحظہ ہو ص ۱۸۷)

Join eBooks Telegram

احمد ندیم قاسمی

جن و انس

گلی میں قدم رکھتے ہی ماسٹر محمد یونس کو محسوس ہوا کہ وہ غلط جگہ پر آگیا ہے۔ بائیں طرف تو خیر ایک مکان کا پچھواڑہ تھا مگر دائیں ہاتھ کوٹھی کی ٹیڑھی میڑھی دیوار پر عورتوں اور ان کے کندھوں سے لگے ہوئے بچوں کے میلے میلے بے ڈھلے چہرے یوں رکھے تھے جیسے گھڑونچی پر چھوٹے بڑے کائی لگے گھڑے سجے ہوتے ہیں۔ گلی طے کرنے تک ماسٹر یونس نے ان کی طرف کوئی تین بار دیکھا اور تینوں بار اسے یہی شبہ گزرا کہ سب نے بچوں سمیت ایک ساتھ اسے آنکھ ماری ہے۔ اگر منشی اللہ یار ناشاد اس کے آگے نہ جا رہا ہوتا تو وہ کہیں رک کر سوچ لیتا کہ اگر آگے جانا بہت ضروری نہیں ہے تو آگے نہیں جانا چاہئے۔ کوڑے کی ایک ڈھیری پر جو مرغی مرغانہ دنکا چگ رہے تھے وہ بھی پہلے تو لڑکھڑا لئے مگر پھر چونچیں کھول کر ماسٹر یونس کو انسانوں کی طرح دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگے۔ سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ گلی کے بالکل مقابل والے دروازے پر جو عورت بائیں کندھے سے چوکھٹ کا سہارا لئے اور صرف بائیں ٹانگ پر زور دئے کھڑی تھی وہ اتنی خوبصورت تھی کہ ماسٹر یونس کو اسے دوسری بار دیکھنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ وہ کالے تہبند کالے چولے اور کالے ڈوپٹے میں سچ مچ چمک رہی ہے۔ پھر اس عورت کے قریب پہنچ کر تو اسے یقین ہوگیا کہ وہ سراسر غلط جگہ پر آگیا ہے۔ عورت نے دماغ کو چیر دینے والی کوئی خوشبو لگا رکھی تھی اور خوشبو صرف سونگھنے ہی کی نہیں، دیکھنے کی بھی چیز ہوتی ہے۔ سو ماسٹر یونس نے خوشبو کے منبع کی طرف دیکھا اور اسے یہ معلوم کرکے صدمہ سا ہوا کہ یہ عورت تو قریب سے بھی خوبصورت ہے۔ کالے ڈوپٹے کے نیچے اس کے ڈھیروں بال اس کے کندھوں اور سینے پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں کی طرف جاتی ہوئی چیری ہوئی آنکھیں پپوٹوں سے آدھی آدھی ڈھکی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹوں پر کچھ ایسی خفیف سی مگر ہمہ گیر مسکراہٹ تھی کہ دیکھو تو نہیں اور سوچو تو بہت کچھ ہے

منشی اللہ یار کے قدموں کی تیزی بتا رہی تھی کہ وہ دائیں طرف کو فوراً مڑ جانا چاہتا ہے مگر یکایک وہ یوں

Join eBooks Telegram

بھولے پن سے رک گیا جیسے نہ رکتا تو اس کا انجام نیک ہوتا۔ ”خیر ہے بیگماں؟“ اس نے عورت سے پوچھا اور پھر فوراً بولا، ”ہمارے سکول میں یہ نئے ماسٹر آئے ہیں، ماسٹر یونس۔ انگریزی پڑھاتے ہیں بی اے پاس ہیں۔“

بیگماں نے سیدھے اٹھ کر اپنی لمبی لمبی بادامی آنکھیں پوری کھول دیں اور بولی ”ہم تمھارے پڑوسی ہیں منشی جی!“

ماسٹر یونس کو جواب میں کچھ نہ سوجھا۔ اس نے صرف مسکرانے کی کوشش کی۔ پھر منشی اللہ یار اس کی مدد کو پہنچا اور کچھ یوں بولا جیسے بیگماں کی بات کا ترجمہ کر رہا ہے، ”یہ بیگماں آپکی پڑوسن ہیں یونس صاحب“

ماسٹر یونس جواب میں ایک بار پھر مسکرایا اور منشی اللہ یار کے پیچھے دائیں طرف کو مڑ گیا۔ سامنے مقفل دروازے کے پاس پہنچنے تک اسے اپنی گدی پر بیگماں کی نظریں محسوس ہوتی رہیں۔ پھر اس نے پلٹ کر چوروں کی طرح دیکھا تو بیگماں وہاں نہیں تھی، صرف اسکی خوشبو تھی جو ہر طرف سے امڈی آرہی تھی۔

”بڑی تیز خوشبو ہے،“ یونس نے آہستہ سے منشی اللہ یار کو جیسے راز کی ایک بات بتائی۔

منشی اللہ یار جو چابی والا ہاتھ تالے کی طرف بلند کر رہا تھا۔ تالے کو مٹھی میں پکڑ کر ذرا سا گھما بیگوں کے دروازے کی طرف دیکھا، پھر یونس سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر عورتوں اور بچوں کا رخ دیکھ کر رک گیا جو دیوار سے ہٹ آئے تھے۔ صحن کے پرلے گوشے میں ایک جھولتے ہوئے چھپر کے پاس دھوپ میں ایک بڑھیا پیڑھی پر بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔ ”خیر ہو دے لے منشیو“ وہ حقہ کا کش ختم کر کے بڑی کراری آواز میں بولی، ”جوانیاں مانو، علم پڑھاؤ، اقبال بڑھے دشمن زیر ہوں جن ڈھیر ہوئی۔ ہم غریب میراثیوں کے آنگن کو تو آج بھاگ لگ گئے۔ اے بالو لے کیا کی اولاد۔ کھڑی بٹ بٹ کیتکے جا رہی ہے کیا اپنی عادتوں سے یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ ہم میراثی ہیں۔ جا کہیں سے لسی مانگ لا۔ سردیوں میں لسی فولاد کا عرق بن جاتی ہے۔ ادھر شیر باز کے ہاں چلی جا۔ کہنا روز اتنی لسی بچتی ہے کہ بچھڑوں کو پلا دیتے ہو۔ آج بچھڑے نہیں پئیں گے تو ہمارے منشی پی لیں گے۔ نمک کی ڈلی وہیں سے گھولتی لانا۔ آج میں نے نمکدانی کے چاروں کانے دیکھے ہیں اس میں چڑیا کی بیٹ جتنا بھی نمک نہیں ملا۔ مجھے تو لسی میں نمک کی جگہ کھار ملا کر پلا دیتی

Join eBooks Telegram

تو۔ پر تو اپنی سی کر دیکھ میں بھی تیرے جیتے جی تو ہرگز نہیں دوں گی وہ اور تھا جسے تو نے ڈس
تھا میں تو مروں گی تیرے جنازے پر شہادت کی انگلی گھما کر“
منشی اللہ یار تالے کو مٹھی میں لئے بڑھیا کی طرف دیکھ رہا، ماسٹر یونس بڑی سنجیدگی کیساتھ
احول سے متعارف ہو رہا تھا۔ ایک میلی کچیلی نوجوان عورت آگے بڑھی "چولھا نے" پر سے
براس کٹورا اٹھا یا اسے اپنے ڈوپٹے سے اندر باہر پونچھا اور بڑھیا کے پاس آکر بولی۔ اے پھوپھی
کرے کہیں کل کی مرتی آج مر جاؤں پر تو ایک ایک روپے کی شرط لگالے پہلے تو مرے گی۔
سب عورتیں ایک ساتھ ہنسیں مگر بانو مسکرائی بھی نہیں۔
بڑھیا بانہوں کو ہوا میں پھیلا کر پکاری۔ اے کنیا کی اولاد اکیا مجھے شرط لگا کر ایک روپیہ ہارنا
ہے۔ پھر ٹھاہ ٹھاہ ہنسنے لگی، بانو بھی مسکرادی اور ہاتھ میں کٹورا لئے چلی گئی۔ منشی اللہ یار بھی زور سے
ا۔ اور ماسٹر یونس نے سوچا کہ یہ کیا بات ہوئی۔ آخر منطق کا وہ کونسا اصول ہے جس کے تحت
ں بڑھیا کا ہنسنا جائز تھا۔ بانو نہ جانے اس کی کیا لگتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ بہو ہوگی مگر ساسیں
یسی منہ پھٹ بہوؤں کو نوچ کر ڈال دیں
یکایک بڑھیا بچوں اور عورتوں پر برس پڑی "تم کیا منشیوں کو اپنے گھیرے میں لئے کھڑے ہو
، اپنے اپنے گھر جاؤ۔ منشی قربانی کا گوشت تھوڑی ہیں کہ چھیٹے پڑ رہے ہو کمبختو“
سب ہنسنے لگے اور ستم یہ کہ منشی اللہ یار بھی ہنس رہا تھا اس نے ہنستے ہوئے تالا کھولا، ہنستے ہوئے
کھولی۔ ہنستے ہوئے کواڑ کھولے اور کوٹھے کے اندر جانے سے پہلے اس نے یہ کہنا بھی ضروری سمجھا
ماسی تو ان آخر تو کسی دن بوڑھی بھی ہوگی!“
"نہیں" بڑھیا نے زبان اور تالو سے نفی کا خاص زوردار پٹاخہ چھوڑ بڑے رعب سے کہا اور پھر سب
ھیا سمیت اس زور سے ہنسے کہ اپنے دروازے پر سے بیگماں پکاری "ماسی نوری بولی ہوگی“
بڑھیا بولی۔ "تو اور کون بولا ہو گا خوشبو آں بیگم“
جھینپنے کی بجائے بیگماں نے بھی زور کا ایک قہقہہ لگایا اور ماسٹر یونس چکرا کر رہ گیا۔ یقیناً وہ
ایت غلط جگہ پر آ گیا تھا۔

Join eBooks Telegram

میٹرک تک ہم جماعت رہنے کے بعد محمد یونس اور اللہ یار کی راہیں الگ الگ ہو گئی تھیں اور اب ماسٹر اور منشی کی حیثیت میں دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے یونس نے اللہ یار سے ایک طویل خط میں تجدید محبت کی تھی اور بھرپور محبت کا جواب پایا تھا۔ یونس مطمئن تھا کہ وہ ایک بالکل اجنبی جگہ میں اجنبی نہیں ہوگا اور اللہ یار خوش تھا کہ وہ اپنے مڈل سکول میں مقرر ہونے والے انگریزی کے ماسٹر کو بڑے ٹھاٹھ سے ساتھ ساتھ لئے پھرے گا۔ دونوں فرض مند تھے اس لئے ملاقات کے بعد پانچ دس منٹ کے اندر وہ جوانی کے چند برس پھاند گئے اور ہم جماعتوں کی اپنائیت برتنے لگے۔

سکول میں ماسٹر یونس کے پہنچتے ہی منشی اللہ یار نے سکول کے چوکیدار کے سر پر اس کا بکس اور بستر رکھا اور اس کے ساتھ چند لڑکے کر دئے، جنھوں نے مل کر کوٹھے کو جھاڑا پونچھا۔ اب تفریح کے وقفے میں وہ یونس کو اس کا مکان دکھانے لے آیا تھا۔ یونس نے جب کوٹھے میں قدم رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہاں تھوڑی ہی دیر پہلے چھڑکاؤ ہو چکا ہے کچے فرش کی مٹی جاگ رہی تھی اور سوندھی سوندھی خوشبو سے کوٹھا لبالب بھرا ہوا تھا۔ چھت کے عین درمیان میں ایک گول سا بادریہ تھا جس میں سے دھوپ ایک ترچھے سے ستون کی شکل میں چھت سے فرش تک گری ہوئی تھی اور کوٹھے کے گوشے تک روشن ہو رہے تھے۔ کوٹھے میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کو مٹی کی دو بڑی بڑی الماریاں بنی تھیں جو دیہات میں سکاریں کہلاتی ہیں اور اناج کے ذخیرے کے کام آتی ہیں۔ منشی اللہ یار نے بعد میں اسے بتایا کہ اب ان سکاروں میں پھٹے ہوئے ڈھول اور ٹوٹی ہوئی ایک شہنائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ رنگ رنگ کے سوت سے بنی ہوئی رنگیلے پایوں کی ایک پلنگڑی رکھی تھی۔ اس پر بیٹھ کر باہر دیکھنے سے کچی ٹیڑھی میڑھی دیوار کا ایک حصہ وہ بیگماں کے گھر کے سامنے والا وہ موڑ نظر آتا تھا جہاں منشی اللہ یار ٹھٹکا تھا۔ راتیوں کے ان نظروں سے اوجھل رہتے تھے جو دوسری طرف ایک دریکوں میں بیٹھے ہوئے گھور رہے تھے ان کے سامنے ایک دالان تھا جس کے ایک کونے میں وہ جھکا ہوا چھپر تھا جس کے پاس بوڑھی نوران پیڑھی پر بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔ یونس کی قیامگاہ سے نکلتے ہوئے بائیں طرف تو یہ چھپر پڑتا تھا اور دائیں طرف ایک تنگ سا صحن تھا جسے ایک پست دیوار بیگماں کے گھر کے صحن سے جدا کرتی تھی اس دیوار کے بالکل سامنے بیگماں کا کوٹھا تھا اور جہاں انھیں بیگماں کھڑی نظر آتی تھی وہ اسکی

Join eBooks Telegram

ڈیوڑھی کا دروازہ تھا

کوٹھے کے فرش اور چھت کی صفائی کا جائزہ لینے کے بعد منشی اللہ یار نے یونس کو بتایا کہ نوراں بانو کی ساس اور مست الست کی ماں تھی۔ بانو کے پیدا ہوتے ہی نوراں نے اسے اپنے بھائی سے اپنے بیٹے کیلئے مانگ لیا تھا۔ مست الست کا نام تو میراں بخش تھا، مگر جب اس نے جوان ہو کر شہنائی بجانی شروع کی اور ساتھ ہی جن آنے لگے تو لوگوں نے اسے مست الست کہنا شروع کر دیا۔ یہ کوٹھا اسی مست الست نے بنوایا تھا۔ کہتے ہیں جب شادی کی محفلوں میں نکاح خوانی کے وقت ڈھولوں اور شہنائیوں کو بند کرنے کا اشارہ کیا جاتا تھا تو مست الست شہنائی پر سے انگلیاں ہٹا کر بچوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ ایکبار جب کسی ایسے ہی موقع پر اس نے شہنائی بجانا بند نہ کی ایک بوڑھے میراثی نے شہنائی کو اسکی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی آواز بے سری ہو گئی تو مست الست نے اپنی لال لال آنکھیں کھولیں۔ شہنائی کو گھٹنے پر رکھ کر توڑتے ہوئے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور انھیں بوڑھے کی طرف پھینکتے ہوئے بولا "لو چچا! آج رات کا چولہا اسی سے جلانا" پھر وہ اٹھا اور چلا گیا۔ جبھی گاؤں والوں کو یقین ہو گیا کہ مست الست پر جن آتے ہیں۔ بوڑھی نوراں دور دور سے تعویذ لاتی رہی اور اپنے بیٹے کو گھول گھول کر پلاتی رہی سونے چاندی کے مڑھے ہوئے کئی تعویذ مست الست کے بازوؤں پر باندھے اور گردن میں لٹکائے پھر کسی نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مست الست کی شادی کر دے کیونکہ جن عموماً کنواروں اور کنواریوں پر ہی آتے ہیں۔ نوراں برسوں سے گانے بجانے اور عید بقر عید کی کمائی جمع کر رہی تھی، فوراً بانو کو بیاہ کر لائی مگر اب مست الست نے شہنائی بجانا ہی بند کر دی یہ اسکی شادی کے کوئی چار مہینے کی بات ہے۔ نوراں نے بانو کو سمجھایا کہ وہ بڑے پیار کے ساتھ مست الست سے شہنائی بجانے کا مطالبہ کرے۔ مست الست یہیں اسی رنگین پلنگڑی پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ بانو نے آکر بھی یہی مطالبہ دہرا دیا تو مست الست بولا "واہ کیوں نہیں بجاؤں گا۔ لاؤ میری شہنائی کہاں ہے" پھر وہ شہنائی بجانے لگا نوراں اور دوسری مراثنیں اور میراثی دروازے سے ہٹ کر خوش خوش شہنائی سننے لگے۔ بیگماں بھی اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر نمودار ہوئی اور مست الست کو دیکھنے لگی بانو جو بڑے غرور کے ساتھ سر اٹھائے اور سینے پر بازوؤں کی قینچی رکھے پلنگڑی کی پائنتی کی طرف کھڑی تھی یکایک گھبرا سی گئی۔ مست الست کا سارا خون کھنچ کر اس کے چہرے میں جمع ہو گیا تھا۔ اس کا ماتھا پسینے کے قطروں سے اٹ گیا تھا اور انگلیاں جیسے تشنج میں گرفتار ہو گئی تھیں

Join eBooks Telegram

تب بانو چیخ کر باہر نکل آئی اور پکاری "میرے مست الست کو تو کچھ ہو گیا ہے" سب لوگ اندر کوٹھے میں
گھس آئے۔ بیگماں باہر گلی میں آ گئی مگر پھر واپس چلی گئی "جن آ گئے ہیں"۔ ایک بوڑھے میراثی نے
کی اور "بسم اللہ" پڑھ کر شہنائی کا سرا ایک جھٹکے سے مست الست کے ہونٹوں میں سے نکال لیا مگر ہوا
کہ شہنائی بوڑھے کے ہاتھ میں آ گئی اور مست الست پیچھے گر گیا۔ پھر جب اس کی نبضیں دیکھی گئیں تو وہ
مر چکا تھا اس وقت نوراں نے دھڑاک سے ایک دو ہتڑ اپنے سینے پر مارا۔ پھر ایک دو ہتڑ بانو کی پیٹھ
پر مار کر بین کرنے لگی "ہائے میرے مست الست کا دم تو یہ سانپنی پی گئی لوگو۔ یہ جو میری بھتیجی ہے، میری بہو
میرے بیٹے کی قاتل ہے۔"

منشی اللہ یار یہ واقعہ سنا چکا تو رازداری کے لہجے میں بولا۔ "ہر ماں جس کا بیٹا اس کی بہو سے پہلے
مر جاتا ہے، بہو کو یہی طعنہ دیتی ہے۔ اور پھر بانو بیچاری تو سیدھی سادی فرمانبردار لڑکی ہے زبان
میرا خیال یہ ہے مست الست پر جن نہیں آئے تھے۔ بیگماں آئی تھی لیکن وہ میراثی تھا اندر ہی اندر
رہا۔ بات زبان پر لاتا تو چیتھڑے اڑ جاتے۔ سو دوسروں کے ہاتھوں مرنے کی بجائے اس نے اپنے آپ کو مار
ڈالا اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی موت کے بعد بیگماں اپنی ڈیوڑھی کے دروازے پر آ
اور مست الست کے کوٹھے کی طرف دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو جاتا مگر وہ دیکھتی رہتی۔"

یونس کچھ یوں خوفزدہ نظر آنے لگا جیسے اسے ایسے گھٹاٹوپ اندھیرے میں لا کر چھوڑ دیا گیا
جہاں بلی کی آنکھیں بھی چیتے کی آنکھوں کی طرح چمکتی ہیں بڑی مشکل سے بولا "کیا آپ کو اتنے بڑے
میں میرے لئے یہی مکان مناسب نظر آیا تھا یار صاحب؟"

"نہایت غیر مناسب جگہ ہے" منشی اللہ یار بڑی عاجزی سے بولا۔ "مگر سردیوں کا موسم ہے
باہر کھیتوں میں رات دن گزارنے والے کسان بھی اپنے گھروں میں اٹھ آتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو
یہ مکان ناپسند ہے مگر میں نے کہا پڑھا لکھا انسان اپنا ماحول آپ بنا لیتا ہے۔ یہاں کسی دوسرے مکان
کی کھوج نہیں رہے گا۔ جب تک اسے سر چھپانے کی ایک جگہ سمجھئے پھر یہ میراثی بڑے تابعدار
بے ضرر لوگ ہیں۔ ڈھول شہنائی کی آوازیں البتہ آپ کو پریشان کریں گی مگر۔۔۔۔۔۔۔"

اتنے میں بانو لسی کا کٹورا ہتھیلی پر رکھے آئی اور "بسم اللہ" کہہ کر اسے یونس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
لیتے ہوئے یونس نے بانو کو آنکھ بھر کر دیکھا اور کٹورا چھلک کر رہ گیا۔ "بسم اللہ بسم اللہ" کہہ کر بانو

Join eBooks Telegram

سوغات

اپنے میلے چیکٹ دوپٹے میں یونس کی شلوار پر گرے ہوئے لسی کے چھینٹے کو جذب کر لینا چاہا وہ "نہیں نہیں کوئی ہرج نہیں" ہکلاتا رہ گیا مگر جب بانو دوپٹے کا پلو سنبھال کر کھڑی ہو گئی تو دوپٹے کا میل یونس کی چمکتی ہوئی شلوار کے بھیگے ہوئے حصے میں منتقل ہو چکا تھا۔ "کوئی ہرج نہیں معمولی بات ہے" اس نے بانو کی گھبراہٹ کم کرنے کیلئے کہا اور پھر اپنی گھبراہٹ کم کرنے کیلئے لسی کا اتنا بڑا کٹورا ایک ہی سانس میں غٹ غٹ چڑھا گیا آخری گھونٹ پر اسے خیال آیا کہ اس نے منشی اللہ یار کا حصہ بھی پی لیا ہے مگر چپکے سے کٹورا بانو کے حوالے کر دیا۔ بانو واپس چلی گئی۔

منشی اللہ یار بولا "بانو کو آپ نے دیکھا؟ اگر کسی صاف ستھری دھلی دھلائی عورت کا ایسا ہی ناک نقشہ ہو تو کیا کوئی عورت اس کے سامنے سے نظریں جھکائے بغیر گزر سکے گی؟ مست الست کے بعد کسی نے اسے کنگھی کئے ہوئے بالوں اور دھلے ہوئے کپڑوں میں نہیں دیکھا۔ اسی لئے لوگ اب یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ بانو پر بھی جن آنے لگے ہیں۔ لوگوں کو یقین ہے کہ مست الست کو اس کے جن نے مار ڈالا ہے اور اب بھی راتوں کو اس کے کوٹھے سے شہنائی اور ڈھول بجنے کی آوازیں آتی ہیں جو اچانک شروع ہوتی ہیں اور اچانک ختم بھی جاتی ہیں اور پھر آدھی رات تک گاؤں کی اندھیری گلیوں میں کوئی سسکتا اور کراہتا ہوا گھومتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈھول اور شہنائی ان سکاروں میں رکھے ہوئے ہیں اور اب تک کسی نے انہیں نہیں چھوا۔ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے لڑکوں کو کوٹھا صاف کرنے کو بھیجا تھا صفا تو وہ کر گئے ہیں مگر کہتے ہیں کہ انھوں نے تالا کھولا تو ان کے پسینے نکل گئے پھر اندر کوٹھے میں وہ جس کونے میں بھی گئے جیسے کوئی انھیں اپنے بالکل قریب لمبی لمبی سانسیں لیتا محسوس ہوا بعد میں بانو فرش پر پانی چھڑکنے آ گئی تو ان کی جان میں جان آئی ادھر فوراً ان نے بانو سے کہا کہ ایک ایک جن سب سے بڑھا کودل، کو پکڑ کر کھیلنے کیلئے دے دو یہ بھی کیا یاد کریں گے کہ میراثیوں کے گھر آئے تھے اس پر سب ہنستے رہے اور یوں ان کا خوف دور ہوا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔"

"کوئی بات نہیں" یونس کو لسی کے کٹورے نے کافی ٹھنڈا کر دیا تھا "جنات جو کہیں رہیں گے وقت اچھا کٹ جائے گا۔"

منشی اللہ یار بڑے اطمینان کی ہنسی ہنسا "مجھے معلوم تھا آپ ایسا تعلیم یافتہ آدمی ان وہموں کو خاطر میں نہیں لائے گا۔"

Join eBooks Telegram

دونوں سکول جانے کو اٹھے ہی تھے کہ بانو لسی کا ایک اور کٹورا لئے آگئی اور اسے منشی اللہ یار کے ہاتھ میں تھما کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ "تم نے حد کر دی بانو" منشی اللہ یار اس کی مدارات سے واقعی گھبرا گیا تھا "یہ کیا بات ہوئی کہ تم ہمارے لئے مٹکے بھر سے لسی ڈھوتی پھرو"

یونس فوراً بولا "پہلے آپ کا حصہ میں پی گیا تھا نا"

"اب ان کا حصہ آپ پی جائیے" بانو نے منشی اللہ یار سے کہا

تینوں ایک ساتھ ہنسے اور باہر سے بوڑھی نوراں کی آواز آئی "ارے بانو، مجھے بھی بتا کیا بات ہوئی، کہیں جن تو نہیں پکڑ لیا منشیوں نے؟"

"اللہ توبہ ہے" بانو نے سنجیدہ ہو کر کانوں کو ہاتھ لگائے اور کٹورا لے کر کوٹھے سے باہر نکل گئی

سکول میں چھٹی کے بعد جب یونس گھر کی طرف روانہ ہوا تو اسے کچھ ایسا لگا جیسے وہ جیتی جاگتی دنیا سے عالم ارواح کی طرف جا رہا ہے، اس نے دوستوں کی محفلوں میں جنات کے وجود سے ہمیشہ انکار کیا تھا لیکن آج دن دہاڑے جنات جیسے اسی کے پر منڈلا رہے تھے اور اس کے کندھوں پر سے جھانک رہے تھے یہ خیال بھی اسے مارے ڈالتا تھا کہ اسے سونے کیلئے جو پلنگڑی دی گئی تھی وہ بانو کی شادی کی تھی اور مست الست نے اسی پر دم توڑا تھا، اسے منشی اللہ یار پر بڑا غصہ آ رہا تھا جس نے اسے اس جہنم میں لا ڈالا تھا جہاں ایک طرف بیگماں کا آگ کی طرح بھڑکتا ہوا حسن تھا دوسری طرف میلی کچیلی بانو اور ٹوٹی پھوٹی نوراں تھی اور درمیان میں جنات سے بھرا ہوا وہ کوٹھا تھا جہاں مست الست کے بعد سا س ہونے ایک رات بھی بسر نہ کی مگر ایک غریب پردیسی استاد کیلئے اسے فوراً ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کرائے پر اٹھا دیا، لالچ بری بلا ہے۔ اس نے سوچا اسی لالچ نے بیگماں کے من کو طوائی کے طشت میں سجے ہوئے بتاشوں کی ڈھیر میں بدل دیا ہے، اور جو جوانی سے لبالب بھری ہوئی بانو ایسی عورت کو شادی والے گھروں میں تمر ایک دونی چونی کے لئے بھک منگوں کی طرح رات دن گانے بجانے پر مجبور کرتا ہے اور ایک بڑھیا کے دل میں جس کا اکلوتا نوجوان بیٹا مر چکا ہے اس خیال کو پھٹکنے بھی نہیں دیتا کہ جس آدمی کو اس نے اپنا مکان پلنگڑی سمیت ڈیڑھ روپیہ ماہانہ کرائے پر دے دیا ہے وہ بھی جوان ہے اور وہ بھی ایک ماں کا بیٹا ہے

یونس اس ارادے سے اپنی گلی میں مڑا کہ وہ بیگماں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا مگر بیگماں

Join eBooks Telegram

کا دروازہ خالی تھا، اس نے اطمینان کی ایک سانس لی اور لپک کر میراثیوں کے صحن میں آ گیا تو نہ چھپر کے پاس اسے نوراں دکھائی دی نہ چولھانے میں اسے بانو نظر آئی، اس نے چابی تالے میں ڈالی تو تالا اسے موت کی طرح ٹھنڈا محسوس ہوا، ایک دم اس پر خوف سوار ہو گیا، یہ سب کمبخت کہاں غائب ہو گئے دن کو جو ننگ دھڑنگ بچے اس نے دیکھے تھے وہ سب کہاں اڑ گئے۔ منڈیروں پر سے چڑیاں تک غائب تھیں ہر طرف الو بول گیا تھا۔

اس نے تالے میں چابی گھما دی، کواڑ کی ایک چول خاصی بھاری آواز میں بولی "آیئے" وہ گھبرا گیا مگر پھر مسکرانے لگا ہمت باندھ کر اندر دیکھا تو چھت کے بادریہ میں سے سورج کی روشنی اب چھ سات دن کا چاند بن کر اس دیوار پر چپک رہی تھی جس کے ساتھ رنگین ہنگڑی رکھی تھی، ایک بھونرا چھت کی ایک ایک لکڑی کو سونگھتا پھر رہا تھا اور اس کے پروں سے ایسی آواز آ رہی تھی جیسے کہیں دور ہوائی جہاز اڑ رہا ہے کچھ سوچ کر اس نے سینہ تان لیا اور ہنگڑی پر جا بیٹھا، مگر بیٹھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ بگیماں دروازے میں کھڑی سامنے گلی میں دیکھ رہی تھی یونس لپکے آہستہ سے ہنگڑی پر بیٹھ گیا اور بگیماں کی یک ٹک تصویر دیکھنے لگا۔

نہ جانے اتنے صاف رنگ پر سیاہ لباس پہننے کا اسے کس نے مشورہ دیا ہے کہ کالے ڈوپٹے کا حاشیہ بھی جگمگا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں کتنی لمبی ہیں کہ کنپٹیوں کے بالوں تک آگئی ہیں اور اس کے ہونٹ کتنے حساس ہیں، بالکل گلاب کی پنکھڑیاں کہ ہاتھ بھر کی بلندی سے بھی تتلی اڑتی ہوئی گزر جائے تو کپکپا کر رہ جائیں اور ٹھوڑی سے مڑتا ہوا خط کتنی لمبی گردن بناتا ہوا اس کے دونوں کندھوں پر بکھر گیا ہے ـــــــــــ یکایک بگیماں پلٹ کر یونس کو دیکھنے لگی، یونس نے گھبرا کر ہنگڑی کے دائیں بائیں دیکھا پھر اٹھ کھڑا ہوا اور بگیماں تالی بجا کر اتنی بے اختیاری سے ہنسی کہ اگر وہ پردیس میں نہ ہوتا تو اس عورت کو ڈانٹ دیتا۔ پھر وہ اندر چلی گئی اور خوشبو کا ایک جھونکا جیسے یونس کے کوٹھے میں چلا آیا۔ ادھر سے بانو تیز تیز قدموں سے آنگن طے کرتی ہوئی بگیماں کے دروازے کی طرف بڑھی وہاں اسے نہ پا کر یونس کے کوٹھے کی طرف دیکھا اور اندر چلی آئی

"آؤ بھی بانو۔ کیسی ہو؟" یونس نے پوچھا

"چھٹی ہو گئی منشی جی" بانو نے پوچھا

Join eBooks Telegram

"ہاں" وہ بولا

"ادھر گلی میں کوئی زور سے ہنسا، میں سمجھی بیگماں ہنسی ہے میں نے سوچا جانے کیا بات ہے باہر آئی ہوں تو گلی خالی ہے جانے کون ہنسا تھا" بانو نے سوال نہ پوچھتے ہوئے بھی سوال سوچھا

یونس بولا "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ کون ہنسا یا کوئی ہنسا بھی کہ نہیں مگر تم ہنسی کی آواز سنکر اس طرف کیوں بھاگیں؟" یونس نے ٹوہ لگانی چاہی

"یہی ذرا ہنس لینے کو جی چاہا" بانو نے جواب دیا "اکیلا آدمی ہنستا بھی بھلا نہیں لگتا"

یونس کے تیور بتا رہے تھے کہ بانو نے وہ الفاظ کہنے سے انکار کر دیا ہے جو وہ اس سے کہلوانا چاہتا تھا

بانو جاتے ہوئے دروازے پر ذرا سا رکی اور پلٹ کر کچھ کہنا چاہا مگر پھر جیسے ارادہ منسوخ کر دیا اور چلی گئی

اور یونس پلنگڑی کو سرکار دن کی طرف کھینچ کر اس پر کچھ ایسے رخ سے بیٹھ گیا جیسے اگر اس کی نظر دروازے کی طرف اٹھ گئی تو بیگماں تالی بجا کر قہقہہ مار دے گی۔

شام سے کچھ دیر پہلے منشی اللہ یار آیا اور یونس کو کوٹھے کے ایک گوشے میں دبکا ہوا دیکھا تو بولا،

لاحول ولا قوۃ، آپ پلنگڑی ادھر کیوں گھسیٹ لائے؟ یہاں تو ٹھٹھر جائیں گے ادھر کھینچئے دروازے پر دھوپ ابھی تک چمک رہی ہے اور دروازے میں سے آپ کم از کم آسمان تو دیکھ سکیں گے۔

یونس پلنگڑی سے اٹھا اور بولا "اس عورت کا نام بیگماں سے آسمان کب سے ہو گیا"

منشی اللہ یار چونکا تو یونس بولا "منشی یار صاحب بات یہ ہے کہ دروازے میں ہر وقت وہ عورت عطر کی دکان لگائے کھڑی رہتی ہے اور یہ کچھ اچھا نہیں لگتا"

"کیا اچھا نہیں لگتا؟" منشی اللہ یار نے مسکرا کر پوچھا "عورت کا کھڑا ہونا یا عورت کا دیکھنا"

"دونوں" یونس یوں ناگواری سے بولا جیسے ماسٹر اللہ یار کو پتہ ہے کہ بیگماں نے ابھی ابھی اپنے قہقہے کا چابک مار کر یونس کی کمر دوہری کر دی ہے

مگر منشی اللہ یار اپنی دھن پر اڑا رہا، وہ پلنگڑی کو گھسیٹ کر اس کی پرانی جگہ پر لے آیا اور بولا

"بیگماں کا لکھا ہوا تو آپ کیلئے برابر ہے، کوؤں کا چہچہانا ہے، وہ آپ کی طرف یا میری طرف یا کسی اور کی طرف نہیں دیکھتی، وہ صرف ایک طرف دیکھتی ہے، بس یہ ہے کہ آدمی اسکے تیور دل سے

گھبرا جاتا ہے۔

پھر منشی اللہ یار نے یونس کا بستر کھول کر پلنگڑی پر بچھایا، سکاروں اور دیواروں پر کھونٹیوں اور کیلوں سے یونس کے کپڑے لٹکائے اور پروگرام کے مطابق اسے گاؤں کے باہر گندم کے لہلہاتے کھیتوں میں لے گیا

سورج افق میں آدھا پیوست ہو چکا تھا، گھروں سے نکلتا ہوا دھواں ایک موٹا میلا سا گھر بن کر گاؤں پر پھیل گیا تھا تھکے ہارے چرواہے مویشی کے گلوں کے پیچھے لمبی لمبی سوٹیاں گردنوں پر رکھے اور ان کے نیچے سے دونوں ہاتھ لٹکائے گردن جھکائے لٹکتے ہوئے بازوؤں کو سہلا دئے جا رہے تھے ان کے ساتھ ساتھ ان کے بھدے بدرنگ کتے تھے جو اپنے آس پاس کی ہر چیز کو سونگھتے جاتے تھے ان میں سے ہر ایک نے تو یونس کے کترانے کے باوجود اس کی شلوار کا پائنچہ سونگھ لیا، درختوں پر چڑیوں نے چیخم چاخ مچا رکھی تھی پھر یکایک چھدرے چھدرے بادلوں سے ڈھکا ہوا آسمان مقبرے کا سنہری گنبد سا بن کر چمکا۔ اٹھا، ہوا تیز ہو گئی جیسے اسی لمحے کے انتظار میں تھی مگر اس تیزی نے گندم کے کھیتوں میں جو مسلسل اور متوازن سرسراہٹ پیدا کی اس نے منظر پہ خاموشی کی تہیں چڑھا دیں، سناٹا اتنا شدید ہو گیا کہ یونس کو ایسا لگا جیسے وہ اچانک بہرہ ہو گیا ہے "یار صاحب" وہ اپنی سماعت کو آزمانے کیلئے بولا، مگر اسے اپنی آواز بجلی کی کڑک کی طرح سنائی دی

"جی" منشی اللہ یار نے کہا

اور یونس بچوں کی طرح بولا "مجھے تو ڈر لگ رہا ہے"

منشی اللہ یار رک گیا، اس نے یونس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہاں کا گوشت اپنی گرفت میں لیکر چھوڑ دیا "حد کرتے ہیں آپ" وہ بولا! "مجھے اس وقت ایک شعر سوجھ رہا ہے اور آپ کو ڈر لگ رہا ہے کمال کرتے ہیں آپ" پھر اس نے پورے آسمان پر ہاتھ گھما کر پوچھا "آپ کو اس خوبصورت نیچر ہی سے ڈر لگ رہا ہے؟"

یونس گھبرا سا گیا، نیچر یعنی لمحہ، مادرائی لمحہ، ارد حیں اور جنات، مست الست اور بانو! ——

"بانو تم کہاں؟" منشی اللہ یار کی آواز آئی اور یونس چیختا چیختا رہ گیا

منظر کے ماند پڑتے ہوئے سنہری پن میں، بانو بالکل غیر یعنی مخلوق معلوم ہو رہی تھی بالکل ان دیکھی

Join eBooks Telegram

کی سی تصویریں جن کے چہروں کے گرد ہالا بنا کر مصور ان کے نقوش کو صرف اس لئے دھندلا دیتے ہیں کہ آسمان کہیں وقت سے پہلے نہ ٹوٹ پڑے بانو کا رخ مغرب کی طرف تھا جہاں سورج ڈوب چکا تھا اور اب اپنے لبادے کے سنہری اور سرخ گوشے لپیٹ رہا تھا تیز ہوا کا رخ مشرق کی طرف تھا جہاں رات جنم لے چکی تھی اور منظر کجلا گیا تھا بجھتے ہوئے اجالے نے بانو کے نقوش کی دلربائی غیر یقینی حد تک بڑھا دی تھی اور تیز ہوا نے اس کے جسم کی تراش کو پوری تفصیل کے ساتھ نمایاں کر دیا تھا

"میں لکڑیاں چننے گئی تھی۔" اس نے کہا اور جیسے سورج نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنے اجالے کو سمیٹ لیا، شام یکایک سیاہ پڑ گئی۔

بانو کے سر پر ہاتھ سے توڑی ہوئی لکڑیوں کا گٹھا تھا جسے اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا

"تم گھومنے نکلے ہو؟" اس نے پوچھا

"ہاں" یونس نے ماحول کا خول توڑ کر باہر نکلنا چاہا۔ "یہ گھوم رہے ہیں اور مجھے گھما رہے ہیں"

بانو ہنسی، یہ ہنسی بیگماں کی ہنسی سے سراسر مختلف تھی، یونس نے سوچا بیگماں کے قہقہے چابک کی طرح سڑاپ سڑاپ برستے ہیں، بانو کی ہنسی بلور کے رنگ برنگ بٹنوں کی سی ہے جو پیتل کی پرات میں گر رہے ہوں

"گھومو اور گھماؤ" بانو اسی طرح ہنستی ہوئی بولی اور چل دی

یکایک یونس کو خیال آیا کہ منشی اللہ یار جو آج دوپہر کو ذرا ذرا سی بات پر ہنس رہا تھا اس وقت کیوں نہیں ہنسا۔ "یار صاحب" اس نے کہا

"جی" منشی اللہ یار جیسے نیند سے چونک پڑا

"کیا اب آپ کو ڈر لگ رہا ہے" یونس نے پوچھا

"ڈر" منشی اللہ یار بولا پھر اس نے دور مغرب کے سرمئی افق پر بانو کے کاجل ایسے سائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "قسم کھا کر کہئے یونس صاحب، کیا آپ نے بانو کی سی عورت دیکھی ہے"

یونس بولا "اگر میں جھوٹ بول دوں کہ ہاں دیکھی ہے تو آپ کیا کر لیں گے"

"میں خودکشی کر لوں گا!" منشی اللہ یار بھرائی ہوئی آواز میں بولا اور یونس سے لپٹ گیا اور یونس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس پر جن آنے والے ہیں

Join eBooks Telegram

عشا کی اذان کے بعد جب منشی اللہ یار ناشاد یونس کو اپنے ہاں کھانا کھلا کر اور اپنی ردی بسورتی ہوئی غزلیں سنا کر ہاتھ میں لالٹین لٹکائے اسے گھر چھوڑنے آیا تو گلیاں سنسان ہو چکی تھیں۔ گھروں کے بند دروازوں سے ادھر کبھی کسی بچے کے رونے کی آواز آجاتی یا سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی کتا یونہی روا روی میں چودھویں کے چاند کی طرف منہ اٹھا کر بھونک دیتا۔ اپنی گلی میں مڑتے ہی یونس کی نظریں بیگماں کے بند دریچے سے ٹکرا گئیں۔ پھر اللہ یار بولا، "لو بھئی یونس صاحب، ہم چلے۔ یہ لالٹین لے لیجئے، جلا لیجئے گا۔"

یونس منشی اللہ یار کی جھجک کا مفہوم سمجھ کر بولا "خدا حافظ، شب بخیر۔"

منشی اللہ یار کوئی جواب دیے بغیر لالٹین تھما کر پلٹ گیا اور جب اس کے قدموں کی آواز بھی بند ہو گئی تو یونس پر چاندنی رات کا آسیب مسلط ہونے لگا۔ خون سر میں جمع ہو کر گونجنے لگا۔ اس کے کانوں کے پاس پھٹا ہوا ڈھول بجنے لگا۔ پھر اسے چیختی ہوئی تنہائی کی آواز بھی سنائی دے گئی اور کسی کی گرم گرم سانسیں اسے اپنی گردن پر محسوس ہونے لگیں۔ وہ تڑپ کر پلٹا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ یکایک اسے خیال آیا کہ اگر بیگماں اسے یوں بوکھلاتا ہوا دیکھ لیتی تو کتنے زور سے قہقہہ مارتی۔ پھر اس نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ اس کے سوٹ کیس میں بی اے کا ڈپلوما رکھا ہے اور وہ انگریزی کا معلم ہے اور جنات صرف ان پڑھ دہمیوں ہی کی تاک میں رہتے ہیں۔ ذرا سا سنبھل کر اس نے کوٹ کی جیب میں سے کنجی نکالی اور آگے بڑھا مگر ابھی میراثیوں کے آنگن میں مڑا ہی تھا کہ بیگماں کا دروازہ کھلا اور ساتھ ہی خوشبو سے لدا ہوا ایک جھونکا یونس پر لڑھک پڑا۔ بیگماں کی آواز آئی "کون ہے؟"

"میں ہوں" وہ فوراً بولا۔

"میں کون؟" بیگماں نے پوچھا۔

"ماسٹر یونس" اس نے جواب دیا۔

"ہم تو ڈر گئے تھے" بیگماں بولی "ہم سمجھے کوئی چور ہے یا کوئی جن۔ دبے پاؤں کیوں چل رہے ہو؟ جوان آدمی ہو۔ جوانوں کے قدموں میں تو بڑی دھمک ہوتی ہے۔"

وہ ذرا سا رکا مگر اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ پھر خود بیگماں ہی نے کواڑ بھیڑ لئے۔ اس نے بڑھ کر اپنے کوٹھے کے

Join eBooks Telegram

تالے کو پکڑ لیا تالا برسوں کا لگا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اس میں کنجی گھمائی اور کواڑ کھولے ایک کواڑ کے قلابے میں سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے کوئی آدمی بولا "آیئے"

وہ لرز کر رہ گیا مگر پھر اسے خیال آیا کہ کہیں بگیاں دروازے کو نیم وا کر کے اس کا مطالعہ کر رہی ہو۔ اور اس خاموش رات میں اس کا قہقہہ ساری فضا میں گونج جائے گا۔ کوٹھے میں داخل ہوتے ہی اس نے دیا سلائی جلائی اور اس کا اتنا بڑا ڈولتا ہوا سایہ فرش، دیوار اور چھت پر پھیل گیا۔ لالٹین جلا کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور پلنگڑی پر گر پڑا مگر پھریری لے کر اٹھ بیٹھا جیسے مست الست کی میت پر گرا تھا۔ سگریٹ جلا کر وہ ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ لالٹین کی روشنی میں اس کا سایہ دروازے پر سے یوں بار بار گزر جاتا تھا جیسے پہرہ دے رہا ہے پھر سوٹ کیس کھول کر ایک کتاب نکالی اور پلنگڑی پر لیٹ کر پڑھنے لگا۔ پڑھتے پڑھتے اسے محسوس ہوا جیسے اس کے چاروں طرف کوئی لمبی لمبی سانسیں لے رہا ہے اور جیسے نکارے کے اندر بیٹھے ہوئے ڈھول پر کسی نے ہاتھ مارا ہے۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور مسکرا کر اپنا سر جھٹک دیا اور غالب کی ایک غزل گنگنانے لگا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس نے لالٹین بجھا دی آنکھیں بند کر لیں۔ وقفے وقفے سے کروٹیں بدلنے کے بعد وہ چت لیٹ گیا اور غالب کی غزل کا یہ مصرع بار بار گنگنانے لگا ؎

پڑے ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

اس کا خوف آہستہ آہستہ دور ہونے لگا

نیند میں اسے کچھ ایسا لگا جیسے کوئی اس کا لحاف کھینچ رہا ہے اس کی آنکھ کھل گئی یہ محسوس کر کے اسے بڑا اطمینان ہوا کہ اس کے لحاف کا آخری سرا وہیں اس کی تھوڑی کے نیچے ہے جہاں سوتے وقت تھا اور کمرے میں سوائے اس کے کوئی نہیں ہے وہ پھر سے وہی مصرع یوں گنگنانے لگا جیسے اسم اعظم کا ورد کر رہا ہو ع پڑے ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کے شبستاں میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی ہے یہ چاندنی تھی جو دروازے کی جھریوں میں سے روشنی کی لمبی سیدھی تیلیاں بنی فرش پر منقش تھی۔ اچھا تو وہ اتنا بہت سا سو گیا تھا کہ چاند جو مشرق سے نکلا تھا، آدھا آسمان طے کر کے مغرب کی طرف کھلے ہوئے دروازے کی جھریوں میں سے جھانکنے لگا تھا۔ تو پھر اب صبح تو خاصی قریب ہوگی۔

Join eBooks Telegram

اچانک چاندنی کی تیلیاں بجھ گئیں مگر پھر جھپک اٹھیں اور یونس کو یقین ہو گیا کہ اس کے دروازے کے سامنے سے کوئی گزرا ہے۔ کون گزرا ہے؟ اس وقت کون ہے جسے یہاں سے گزرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ دروازے کی جھریوں کا ایک بڑا حصہ پھر سے بجھ گیا اور بجھا رہ گیا۔ وہ چیخ اٹھا۔ "کون ہے؟" سایہ ہٹ گیا اور یونس جھجک گیا۔ مگر دروازے کی کنڈی کھول دی "آئیے" دروازہ بولا اور چاندنی جیسے کواڑوں کا بند توڑ کر اندر ابل پڑی۔ یونس نے آہستہ سے باہر قدم رکھا اور یوں بولا جیسے اپنے قریب ہی کھڑے ہوئے کسی غیر مرئی وجود سے سرگوشی کر رہا ہے "کون ہے؟"

کوئی جواب نہ پا کر وہ گلی میں آیا، بیگماں کی ڈیوڑھی کے بند دروازے کو دیکھا۔ گلی میں جھانکا جھانکتے ہوئے اس نے ذرا دائیں کو ہو کر میراثیوں کے گھروندوں پر نظر ڈالی جو قبروں کی طرح ایک دوسرے میں گھسے ہوئے کھڑے تھے۔ "عجیب بات ہے" اس نے زیر لب کہا اور کوٹھے میں آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے رک گیا، دروازہ کھلا رہنے دیا اور پلنگڑی پر دائیں کروٹ کو لیٹ کر دروازے سے باہر دیکھنے لگا

اسے منشی اللہ یار یاد آ گیا، اگر وہ بانو سے پیار کرتا ہے تو اس کا اظہار کیوں نہیں کرتا، بانو واقعی بڑی پراسرار عورت ہے، اچٹتی نظر سے دیکھو تو دوسری نگاہ ڈالنے کی طلب ہی محسوس نہ ہو اور جو ذرا غور سے دیکھو تو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ اس کے نقوش تکمیل کی انتہائی تفصیلوں تک مکمل ہیں مگر کھلی خشک میلی لٹیں دھجیوں کی طرح لٹک لٹک کر آنکھوں اور منہ میں پڑ رہی ہیں، کرتے میں کوئی چار جگہ تو پیوند لگے ہیں، اس کے ہاتھ کتنے میلے اور میلے ہیں کھردرے بھی ضرور ہوں گے۔ پاؤں بالکل تنور کے سے ہیں، پھیلے ہوئے پنجے اور پھٹی ہوئی ایڑیاں۔ پھر وہ ان کڑاکے کے جاڑوں میں بھی ننگے پاؤں رہتی ہے، اس کا رنگ یقیناً صاف ہو گا، اس کی گردن سے ذرا نیچے کا حصہ جو کرتے کے بٹن کے قریب نظر آ رہا تھا کتنا صاف تھا، چاندنی کا سا، یہی اس کا اصلی رنگ ہو گا، پر چہرے کا میلا سانولا رنگ اس کا اصل رنگ نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ دو تین دن تک انگریزی صابن سے منہ ہاتھ دھو لے تو یہ میل اتر جائے۔ منشی اللہ یار سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ اسے صابن کی ایک ٹکی ہی لا دے۔ محبت کرنے والوں کی یہ قسم بھی عجیب ہوتی ہے کہ فراق یار میں زار زار رو لیں گے مگر محبوب پر ایک اکنی خرچ کرنے کی انھیں توفیق نہیں ہو گی۔ یونس نے سوچا کل وہ منشی اللہ یار کی محبت کو غیرت

Join eBooks Telegram

دلائے گا۔ مگر وہ تو کہتا ہے کہ وہ بانو کو آخر دم تک نہیں بتائے گا کہ وہ اس سے پیار کرتا ہے اس لئے کہ اب صرف اللہ یار محرومی کی آگ میں جھلس رہا ہے، پھر بانو بھی اسی جہنم میں جھونک دی جائیگی کیونکہ دونوں کو یہ معلوم ہو گا کہ ——— ہم "، منشی اللہ یار نے کہا تھا، "ہم سماجی مقامات کے کھونٹوں کے ساتھ کتوں کی طرح بندھے ہوئے ہیں اور ہم زنجیر توڑ کر بھاگیں گے تو آوارہ کہلائیں گے

یہ کیسی عجیب رنی رٹائی کتابی محبت ہے! یونس نے سوچا اور ادھر منشی اللہ یار ہر سال ایک نئے بیٹے کا باپ بھی بن جاتا ہے اور یہ بھی دیکھتا رہتا ہے کہ بانو دوسری میراثنوں کے ساتھ صرف ایک دونی چونی کیلئے دن بھر ڈھولک کوٹتی ہے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتی ہے اور جب وہ دلہن کی آمد کے بعد سب میراثنوں کے ساتھ چند پیسوں کی خاطر بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلا کے دولہا کے باپ کا تعاقب کرتی ہے تو اس کے جسم کے تناسب کے مقابلے میں اس کا یہ غیر متناسب انداز کتنا بھونڈا کتنا چھوٹا معلوم ہوتا ہے ——— "مگر بے چاری کرے بھی تو کیا کرے!" منشی اللہ یار نے کہا تھا، "اگر میں اسے ہر مہینے پانچ، دس روپیے دیا کروں تو میری بیوی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی مگر بانو کی پھوپھی تو اس سے پوچھے گی کہ یہ دست غیب کا گر تم نے کس مردوے سے سیکھا اور پھوپھی کو یقین ہے کہ بانو چڑیل ہے، صرف اس کے پاؤں پچھلی طرف مڑنے سے رہ گئے ہیں۔ وہ کہتی ہے مست الست کو یہی چڑیل نچوڑ کر پی گئی وہ اسے گالیاں دیتی ہے اور کوستی ہے مگر ساتھ ہی اسے بہلاتی بھی ہے کہ اگر بانو کہیں ادھر ادھر ہو گئی تو کہیں وہ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کیلئے محتاج نہ ہو جائے ہیں یہ سب دیکھتا ہوں اور کڑھتا ہوں اور خون جگر پیتا ہوں، میں اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہوں یونس صاحب!"

منشی اللہ یار کی باتیں یاد کرکے یونس کو ہنسی آگئی۔ عجیب بودا عشق ہے!

چاندنی میں کوئی گلی کی طرف سے آیا اور بیگماں کے بند دروازے کے پاس رکے بغیر اندر چلا گیا، تو کیا بیگماں کا دروازہ کھلا تھا ——— ؟

وہ جوتے پہنے بغیر باہر لپکا اور میراثیوں کے گھروں کو بیگماں کے گھر سے جدا کرتی ہوئی پست حد بندی کے پاس جا کر اس نے دیکھا کہ بیگماں ایک آدمی کے ساتھ صحن کو طے کرکے دروازے تک پہنچی پھر اس نے دروازہ کھولا، دروازے کے بالکل سامنے ایک دیا جل رہا تھا دونوں اندر چلے گئے۔ دروازہ بند ہو گیا

Join eBooks Telegram

اور دیا بجھ گیا

وہ دروازے کو اتنی دیر تک گھورتا رہا کہ دروازے میں حرکت پیدا ہو گئی اور جس حد بندی پر وہ کہنیاں رکھے کھڑا تھا وہ نیچے دھنسنے لگی پیچھے ہٹ کر اس نے سر جھٹکا واپس اپنے کوٹھے میں آیا تو اس کی سانس پھول رہی اور جسم تپ رہا تھا پھر اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس کے کھلے دروازے کے سامنے سے شپ سے نکل گیا ہے۔ یونس چونکا مگر پھر آنکھیں ملتے ہوئے پلنگڑی پر گر پڑا

کاش منشی اللہ یار کہیں آس پاس ہوتا تو وہ اس سے لپٹ جاتا

صبح، یونس منشی اللہ یار کے ہاں چائے پینے گیا تو اسے رات کا سارا واقعہ سنایا

"اونچا سا قد تھا؟" اس نے پوچھا

"ہاں" یونس بولا

"بڑا سا طرہ تھا؟" منشی اللہ یار نے دوسرا سوال پوچھا

"نہیں تو" یونس نے جواب دیا میرے خیال میں ننگے سر تھا، پگڑی شاید اس نے بغل میں دبا رکھی تھی۔"

"پگڑی بغل میں ہو تو طرہ سر پر نہیں ہوتا" منشی اللہ یار کو دل لگی سوجھی پھر بولا "راجہ ہوگا"

"راجہ؟" یونس نے حیران ہو کر پوچھا

"ہاں ہاں" وہ بولا آ گیا ہو گا پردیس سے، چھوٹے بھائی کو کہیں نوکر کرانے گیا تھا۔ بیگماں کو معلوم ہوگا کہ راجہ واپس آرہا ہے، اسی لئے تو وہ اتنی چہک رہی تھی، میں نے کہا تھا نا بیگماں کو گمراہ کہا جاسکتا ہے اسے بدمعاش یا آوارہ کہنا مشکل ہے۔ بس وہ عشق ایسے دھڑلے سے کرتی ہے کہ آوارہ معلوم ہونے لگتی ہے اس کا شوہر اس کے انہیں تیوروں سے تنگ آ کر کہیں بھاگ گیا ہے، بیچارے پارچہ باف ہیں پھر جگہ جگہ کپڑے کے کارخانے لگ گئے تو کھڈی توڑ کر ہل بنا لیا اور مزارعت شروع کر دی، سال بھر کا غلہ کما لیتے تھے۔ راجے سے بیگماں کی آنکھ وہیں کہیں کھیتوں میں لڑی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک دن شوہر نے جو بیگماں پہ بالکل فدا تھا، بیگماں کے تھپڑ دے مارا تھپڑ مار کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ پھر منہ لپیٹ کر گھر سے نکلا اور دو ڈھائی سال ہونے کو آئے ہیں، پلٹ کر نہیں آیا۔ کہتے ہیں ادھر بلوچستان کی طرف

Join eBooks Telegram

سے ایران کی سرحد پار کر گیا۔ پچھلے سال اس گاؤں کا ایک آدمی خشکی کے راستے حج کرنے گیا تھا۔ اس نے آکر بتایا کہ بیگاں کا شوہر اسے ایران میں سڑک کے کنارے ایک پٹرول پمپ کے پاس ایک میلا سا، چیتھڑا ہاتھوں میں لئے کھڑا نظر آیا تھا۔ واللہ اعلم۔ ادھر راجے کے عشق کا چرچا ہوا تو بیگاں کا بھائی اللہ نواز تبر ہاتھوں میں لئے بہن کے گھر آیا اور قیامت مچا دی۔ پھر جب بیگاں نے اسے رو رو کر یقین دلایا کہ سب دشمنوں کی کارستانی ہے تو اب اللہ نواز نے بہن کی خاطر سارے گاؤں سے لڑائی مول لے رکھی ہے۔ بیگاں کی جان ڈھال ہیں اسی لئے تو یہ بلا کا جتّا ہے۔ میدان صاف دیکھ کر بڑے بڑوں نے قسمت آزمائیاں کی ہیں مگر بیگاں نے سب کو ٹھوکر پر اٹھا کر یوں اچھالا ہے کہ سب منہ کے بل گرے ہیں اب یہ سب لوگ بیگاں کے جانی دشمن ہیں مگر بیگاں ہے کہ تیوری پر بل ہی نہیں آنے دیتی۔ اپنی لگن میں مگن ہے چار پانچ سال پہلے لڑکا ہوا مگر مر گیا۔ پھر شوہر بھی چلتا بنا جب سے اکیلی ہے مگر اکیلی معلوم نہیں ہوتی۔ اکیلے تو ہم جیسے ہوتے ہیں کہ گھر میں بیوی بچے ہیں مگر باہر گلی میں آؤ تو جیسے پنجرے میں سے نکلے ہوں۔"

منشی اللہ یار ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ پھر بولا "آپ بیگاں کی پروا نہ کیجئے اپنے کام سے کام رکھئے آپ کو اس سے کیا کون آیا کون گیا"

"مجھے کیا" یونس نے جیسے احتجاجاً کہا

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ آپ کو کیا۔ گھوڑے پر پھول کھلے یا گدھا لوٹے، آپ کو کیا!" منشی اللہ یار نے، یونس سے عمر میں ایک سال بڑا ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا پھر آہستہ سے بولا "بانو کیسی ہے"

"میں نے اسے کل کھیتوں کے بعد اب تک نہیں دیکھا" یونس نے جواب دیا۔

منشی اللہ یار فوراً بولا۔ "ڈاکٹر اقبال صاحب تو کہہ گئے ہیں ع ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ"

یونس مسکرا کر بولا "تو پھر دیکھ"

مگر منشی اللہ یار رنجیدہ سا ہو گیا۔ پھر یونس نے اس خوف سے وہاں سے اٹھ آنا چاہا کہ کہیں دنگل کی طرح اس سے لپٹ کر رونے نہ لگے

وہ اٹھا مگر پھر بیٹھ گیا "یار صاحب! رات جنات کو میں نے خوب جکڑ دئے اور خوب مرچکے تو یا مگر"

"میں نے تو جان بوجھ کر جنات کا ذکر نہیں چھیڑا تھا" منشی اللہ یار نے ایک بار پھر اپنے بڑے پن کا مظاہرہ کیا۔

Join eBooks Telegram

یٔے تو میں سو بانو خوب مزے سے مگر جب آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک بار ایک سایہ میرے دروازے
منے سے گزرا، دوسری بار یہ سایہ میرے دروازے کے سامنے یوں رک گیا جیسے جھریوں میں سے
راہے میں فوراً باہر آگئی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

راجہ اس سے پہلے بیگماں کے ہاں آیا یا بعد میں؟" منشی اللہ یار نے تفتیش شروع کی

بعد میں،" یونس جواب دیا

تو پھر وہ بیگماں ہو گی۔" منشی اللہ یار بولا آپ نئے نئے آئے ہیں اس لئے وہ جائزہ لیتی پھرتی ہو گی
کوئی جاگ تو نہیں رہا۔ ٹوٹتی راتوں کو تو کتے بھی سو جاتے ہیں اس لئے کمبختوں نے ملاقاتوں
کا سب وقت چن رکھا ہے مگر بیگماں کو آپ کا کیا اعتبار۔ ———— یقیناً بیگماں ہو گی

ی ہو گی،" یونس بولا

سہ پہر کے وقت میں، منشی اللہ یار کے ہاں کھانا کھا کر یونس مفلر لینے کے بہانے گھر چلا آیا۔ بیگماں کا
دروازہ کھلا تھا مگر خالی تھا۔ اس نے پلٹ آنا چاہا مگر جب تک وہ پلٹنے کا فیصلہ کرتا اپنے صحن میں تڑ آیا
بڑھی نوراں چھپر کے قریب پیڑھی پر بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے حقہ پی رہی تھی یونس کو دیکھتے ہی
بلا دیا۔ "ایلو میں ابھی ابھی سوچ رہی تھی کہ میرا منشی آئے تو پوچھوں کیا تیرے پاس جوڑوں کے درد
کی گولی ہے لے میں صدقے تو تو خضری عمر پائے گا، اللہ اقبال بڑھے، اللہ ترقیاں دے

لی تو ہے خالہ۔" یونس بولا مگر وہ جوڑوں کے درد کی نہیں، سر کے درد کی ہے

اے بسم اللہ پہلے درد کا پٹاخہ سر میں ہی تو چھوٹتا ہے،" نوراں نے اپنے سوکھے لمبے بازو اٹھا کر دونوں
ں میں اپنا سر تھام لیا۔ "جوڑوں میں درد سر کے راستے ہی تو اترتا ہے، میں تو صبح سے کٹے ہوئے گوشت
یر کی طرح پڑی ہوں بجھا حقہ پی رہی ہوں، اٹھ کر ٹوپی میں ایک چنگاری تک نہیں رکھ سکتی اور
کی اولاد بانو اگنی کی لسوار خریدنے گئی ہے تو وہیں کی ہو کر رہ گئی ہے۔ لے تیرے بچے جئیں ایک گولی
ے۔"

ک گولی مجھے بھی دینا منشی جی۔" بیگماں کی آواز آئی اور یونس ہڑبڑا کر پلٹا۔ بیگماں کھلے لمبے بالوں کا ایک
سینے اور کندھوں پر بکھیرے دروازے میں کھڑی تھی مگر اس سے خوشبو نہیں آ رہی تھی۔

تجھے کیا ہوا خوشبوؤں بیگم۔" نوراں نے پکارا

Join eBooks Telegram

"اے خالہ" بیگماں بولی "میں نے کہا آج سر دھولوں، سر دھو کر بال سکھانے دھوپ میں بیٹھی بال سوکھ گئے ہیں مگر سر پکڑا گیا ہے۔"

"خوشبو بھی تو پکڑتی ہے سر کو" نوراں بولی اور بیگماں ہنسنے لگی

"یونس نے تالا کھولا، اندر جا کر گردن میں مفلر ڈالا، ایسپرو کی تین گولیاں نکالیں تالا بند کر کے گولی اس نے نوراں کو دی اور پھر بیگماں کی طرف بڑھا۔ اس کے جسم میں سے اتنی بہت سی ٹھنڈی گرم لہریں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزرنے لگیں کہ وہ سمجھا بیگماں تک پہنچتے پہنچتے وہ کٹ کر ڈھیر ہو جب اس نے بیگماں کے ہاتھ پر دو گولیاں خاصے فاصلے سے ٹپکائیں تو اسے بیگماں دکھائی ہی نہ دی، جانے اس نے کیسے کہہ ڈالا کہ۔ "ایک کھا لو ایک رکھ لو پھر کبھی کام آجائیگی" یہ کہکر وہ گلی میں شرابیوں طرح لڑکھڑاتا ہوا سا نکل گیا پھر اس نے بوڑھی نوراں کی آواز سنی۔ وہ بیگماں سے پوچھ رہی تھی، "کہہ رہا تھا تم سے؟"

یونس سن سے رہ گیا۔ بیگماں کو ایک فالتو گولی دے کر جیسے اس نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ

بیگماں کی آواز آئی "کہہ رہا تھا گولی پانی سے کھانا"

تو کیا بیگماں کو معلوم تھا کہ ایسپرو کی دوسری گولی میں یونس کی محبت اور ناموس دونوں سم گئے ہیں۔

یونس نے پلٹ کر بیگماں کی طرف دیکھا تو وہ تالی بجا کر اس زور سے ہنسی کہ یونس وہاں سے تقریباً وہ گھر کی طرف آتی ہوئی بانو کے قریب سے بھی زن سے گزر گیا اور سکول پہنچ کر بچوں کو ایسے لطیفے سنائے کہ وہ لوٹ پوٹ ہو کر رہ گئے۔

سانپ اگر زہریلا نہ ہوتا تو بچوں کا نہایت محبوب کھلونا ہوتا کوئی بڑے سے بڑا القراۃ قسم کا بچہ بھی کی منقش جلد، اسکی بے آواز رفتار اور اس کے لہراؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتا مگر سانپ کے اسے ایک مردود مخلوق بنا دیا ہے۔ یونس کبھی سانپ کے پھن سے بے پروا ہو کر آگے بڑھتا اور کبھی کی دو شاخہ زبان دیکھ کر کانپ جاتا وہ کبھی اس کی جلد پر سے کوڑیاں اٹھا لینے پر آمادہ ہو جاتا اس کی پھنکار سے ڈر کر ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیتا۔ وہ بیگماں کو بائیں کندھے سے چوکھٹ کا

Join eBooks Telegram

صرف بائیں ٹانگ پر زور دیے سیاہ کپڑوں میں ملبوس کھڑا دیکھتا تو بیگماں کے چہرے اور ہاتھوں
تی ہوئی شعاعیں اسے اپنے ہالے میں جکڑ لیتیں۔ لمبی لمبی بڑی بادامی آنکھوں کی روشنی اسے اپنی گرفت
یتی اور وہ گلی میں داخل ہوتے ہی مسمریزم ماسٹروں کے معمول کی طرح یوں بے ارادہ قدم اٹھانے
ے بیگماں کے دروازے کے سامنے سے دائیں طرف اپنے کوٹھے کا رخ نہیں کرے گا، بلکہ بیگماں کے
رک جائیگا، رو پڑیگا۔ اس سے لپٹ جائیگا مگر جب رات آخری دموں پر آتی اور اس کے سامنے سے
ادھر سے ادھر کئی بار گزر چکے ہوتے اور جھریوں میں سے جھانک چکے ہوتے اور رات بھر کے جاگے
لوگ بھی سو چکے ہوتے تو راجے کے انتظار میں جھکا ہوا یونس دیکھتا کہ راجا آتا وہ سیدھا بیگماں
ڑھی میں داخل ہو جاتا، پھر اسے بیگماں اپنے کوٹھے میں لیجاتی کوٹھے کے کواڑ کھلتے تو دروازے
نکل سامنے ایک دیا ان دونوں کے سایوں کے خطوط کو واضح کر دیتا پھر کواڑ بند ہو جاتے دیا
۔ رات سناٹے کے شکنجے میں آجاتی، سارا گاؤں دم سادھ لیتا اور یونس کا جی چاہتا کہ وہ بیگماں کے
ے اس کے صحن کو جدا کرتی ہوئی ذرا سی دیوار کو پھاند جائے اور اس کے کوٹھے کے بند کواڑوں پر
ے تھوک دے اور پوری قوت سے چلا کر کہے "بدذات، بدمعاش، بدچلن۔"

پھر اس کا رونے کو جی چاہنے لگتا۔

صبح ہو جاتی، بانو سر پر مٹی کا ایک برتن رکھے اڑوس پڑوس سے لسی جمع کرنے چلی جاتی بوڑھی
ایک ہاتھ میں حقہ اور دوسرے میں پیڑھی لئے دھوپ میں اس جگہ آبیٹھتی، جہاں سے وہ دھوپ
ساتھ ساتھ سرکتی ہوئی شام کو اپنے کوٹھے میں چلی جاتی۔ مرغیاں مرغے ڈربوں سے نکل کر گھورے
یوں لپکتے جیسے رات وہاں ان کے لئے کوئی غیبی ہاتھ اناج کی مٹھیاں بکھیر گیا ہے، میراثنیں
ں ڈیلے گوبر جمع کرنے نکل جاتیں ان کے ٹھٹھرتے ہوئے بچے یونس کے کوٹھے میں چھا جاتے اور
وں، بنوں کے بنٹے تنو کا مدن پر روانہ ہو جاتے، کوئی دھواں چھوڑتے ہوئے اپلے پر ایک
ہ رکھے واپس آتا کسی کے بازوؤں میں چولھا گرم کرنے کیلئے باجرے کے سوکھے ٹانڈے ہوتے
سی سے بھرے ہوئے پیالے کو مارے احتیاط کے چھلکاتا ہوا ننھے ننھے قدم اٹھاتا یونس کے گھر کے سامنے
زر کر غائب ہو جاتا جس روز راجہ بیگماں کے پاس آتا اس روز وہ بہت دیر سے اٹھتی یا کم سے کم د
س کو تفریح کے وقفے سے پہلے تک کہیں نہ دکھائی دیتی، لیکن جس روز وہ نہ آتا، بیگماں سویرے ہی بیلی

Join eBooks Telegram

کرن کے ساتھ ہی ڈیوڑھی کے دروازے پر آکھڑی ہوتی اس کے بالوں کا ڈھیر اس کے کندھو
سینے پر بکھرا ہوتا، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسا کر انھیں الٹا کرتی اور بازوؤں کو سر پر لیجا
جب لمبی لمبی انگڑائیاں لیتی تو کالے کرتے کی کھلی آستینیں اس کے کندھوں پر گر پڑتیں اور اس
سڈول بازو چمک اٹھتے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ وہ آئی دروازے پر کھڑی رہی اور یونس کے
کی طرف دیکھے بغیر اندر چلی گئی، لیکن جب بھی وہ یونس کی طرف دیکھتی، یونس اس کی طرف
بے حیائی سے دیکھ رہا ہوتا اور وہ تالی بجا کر اور قہقہہ مار کر اندر بھاگ جاتی

ایک بار وہ قہقہہ مار کر اندر جانے والی ہی تھی کہ ادھر سے بانو لسی کا برتن سر پر رکھے آگئ
اور بولی "کیا بات ہو گئی بیگماں"

اور ہنستی ہوئی بیگماں نے یونس کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہہ دیا "کچھ نہیں بانو! منشی جی کو دیکھ
ہنسی آگئی تھی کہ اکیلا چاہے آدمی ہو چاہے چڑا کیسا الٹا الٹا لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے اٹھا کر سامنے
اور کہانی سنانے لگو۔"

پھر وہ زور سے ہنستی ہوئی اندر بھاگ گئی اور بانو میلے سانولے چہرے پر ڈھول سی اڑا
ہوئی سیدھی یونس کے دروازے پر آکر بولی "سنا منشی جی بیگماں کیا کہہ رہی تھی؟"

یونس ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ بیگماں کی بات سن کر خوش ہو یا خفا ہو، اس لئے خا
خالی آنکھوں سے بانو کی طرف دیکھا اور بولا "کوئی بات نہیں، پڑوسن ہے اس کا حق ہے۔ جو چا
کہہ لے۔"

"پڑوسن تو ہے" بانو بولی اور چلی گئی۔

پھر یونس کو خیال آیا کہ اس نے متوازن بات نہیں کہی۔ بات کو واضح کرنے کیلئے وہ فوراً با
آیا، بانو اپنے کوٹھے میں داخل ہو رہی تھی اور بوڑھی فوراں پیڑھی اور حقہ لئے دھوپ میں بیٹھ
رہی تھی "رد بلائیں دور بلائیں" وہ بولی۔ اور یونس اپنے کوٹھے میں آگیا۔

اس روز منشی اللہ یار بار بار یونس کو یاد دلاتا رہا کہ اس کی صحت خراب ہو رہی ہے اور اس
آنکھیں سوجی رہتی ہیں اور اس کے ہونٹ تک زرد پڑے جا رہے ہیں اس نے مست الست
کوٹھے کے آسیب زدگی کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر دو ایک روز میں اسے نیا مکان نہ ملا تو وہ بال بچوں کو

Join eBooks Telegram

گاؤں بھیج کر یونس کو اپنے ہاں لے آئے گا، یہ بھی کوئی بات ہے۔" اس نے کہا "میں وہمی آدمی نہیں
ہوں لیکن یہ جنات کی کارستانی نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ آئے تھے تو سرخ انار ہو رہے تھے اور اب کل
ایک مہینے بعد یوں معلوم ہوتا ہے جیسے آپ سکول میں نہیں ہیں ہسپتال میں ہیں۔"

رات یونس نے بڑے اضطراب میں گزاری۔ لالٹین کی روشنی میں پڑھنے کی بھی کوشش کی مگر
آج اس کا جی نہیں لگ رہا تھا۔ چاند کی چودھویں تھی مگر اس کے دروازے کا رخ مغرب کو تھا اس
لئے چاندنی بہت دیر تک اس کے کواڑوں کی جھریوں میں نہ جھانکی۔ منشی اللہ یار سے آسیب کا ذکر
سن کر اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج وہ اس سائے کو ضرور پکڑے گا جو قریب قریب ہر رات اس کے
دروازے کے سامنے سے گزرا اور کبھی کبھی یوں رکا جیسے اندر جھانک رہا ہے۔ پھر جب چاندنی تیلیاں
سی بن کر اس کے فرش پر منقش ہو گئی تو وہ اٹھا اور آہستہ سے دروازے کی زنجیر کھول کر واپس پلنگڑی
پر آ بیٹھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ادھر سایہ اس کے دروازے کے سامنے سے گزرے گا ادھر وہ لپک
کر کواڑ کھولے گا اور اسے دبوچ لے گا اور شور مچا دے گا۔ آسیب سے مقابلے کا جذبہ اتنا شدید ہو رہا تھا
کہ سکار کھول کر اور اندر ہاتھ لیجا کر اس نے پھٹے ہوئے ڈھول پر ایک ہاتھ مار دیا اور سنسناتی بھی چھوٹی

وہ بہت دیر تک بیٹھا دروازے کو دیکھتا رہا، چاندنی کی تیلیاں بہت لمبی ہو گئیں مگر سایہ غائب
رہا۔ ایک بار وہ باہر نکل کر صحن میں بھی گھوم آیا واپس آ کر کواڑ بھیڑ دئے اور ٹہلنے لگا اسے لیے جھنجھی سی ہونے
لگی۔ پھر یکایک اسے باہر بہت سے آدمیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ آہستہ سے کواڑ کھولے تو دبا دبا شور
واضح ہو گیا۔ پست دیوار کے پاس جا کر اس نے بیگماں کے گھر میں جھانکا۔ پانچ چھ آدمی بیگماں کے کوٹھے کے
دروازے پر جمع تھے۔ دروازے کا رخ مشرق کو تھا اس لئے وہاں اندھیرا تھا۔ پھر دروازے پر کسی نے
دوبارہ ہاتھ مارا اور آواز آئی۔ "دونوں سن لو بیگماں اور راجے۔ تم دونوں سن لو کہ آج تمہاری زندگی
کا آخری دن ہے، ہم اللہ نواز کو بلانے جا رہے ہیں تا کہ اپنی بہن کا بندوبست وہ خود کر لے، جب تک وہ آتا ہے تم
جو چاہو کر لو۔ اس کے آنے کے بعد اسکی تم ہو گی اور تمہاری گردنیں ہوں گی۔ غضب خدا کا چھٹی چاندنی
میں بدمعاشیاں ہو رہی ہیں، گاؤں کے گاؤں کو پلید کر ڈالا ہے۔ تمہاری حفاظت کیلئے ہم نے
باہر سے کنڈا لگا دیا ہے جب تک مرضی کرو۔" پھر وہ ہنسا اور چاندنی میں کھڑے ہوئے لوگوں کے پاس آ گیا

Join eBooks Telegram

یونس نے کان دھر کر سنا، اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ بیگماں اکیلی ہوتی تو یقیناً لڑک کر جواب دیتی تو پھر راجہ بھی اندر ہی ہے اور دروازہ بھی باہر سے بند ہے اور ایک دوسرے میں کھسر پسر کرتے ہوئے آدمیوں میں سے ایک آدمی کٹ کر ڈیوڑھی کی طرف جا رہا ہے۔ وہ یقیناً اللہ نواز کو بلانے جا رہا ہوگا

یونس دیوار پر سے ہٹ آیا اور جب وہ آدمی گلی میں نکل گیا تو یونس اپنے کوٹھے کے دروازے کے پاس سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یکایک وہ تڑپ کر اٹھا، میراثیوں کے چھپر میں سے ایک لمبی سی لکڑی کھینچی اور ادھر گلی میں بھاگ نکلا، گھوم پھر کر وہ بیگماں کے پچھواڑے تک پہنچ گیا اور کچی دیوار پہ بھاری لکڑی کی ضربیں لگانے لگا، دھم دھم کی یہ مسلسل آوازیں رات کے سناٹے کو گونجا گئیں اور بیگماں کے صحن میں کھڑے ہوئے لوگ یہ سوچکر کوٹھے کے پچھواڑے کی طرف بھاگے کہ راجہ اور بیگماں دیوار میں نقب لگا کر بھاگ نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں

بہت سے قدموں کی دھپ دھپ سنکے یونس لکڑی اٹھائے ایک اور گلی میں نکل گیا اور پھر لکڑی وہیں پھینک کر سرپٹ بھاگا۔ بیگماں کے پچھواڑے کی گلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا کہ لوگ ابھی وہیں جمع ہیں۔ پھر وہ بجلی کی سی تیزی سے اپنی گلی میں آیا اور بیگماں کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے ہی لگا تھا کہ کسی نے اس کی کمر میں بازو ڈال کر اسے دائیں طرف اپنے کوٹھے کے صحن میں گرا دیا، اسے گرانے والا بھی ساتھ ہی گرا، وہ فوراً کھڑا ہو گیا مگر پھر وہیں کھڑا رہ گیا

"میں بانو ہوں۔ بانو۔ میں اور کوئی نہیں ہوں۔ میں بانو ہوں" بانو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اکٹھے بہت سے جاگتے ہوئے آدمیوں کے قدموں کی آواز قریب آنے لگی تو بانو نے یونس کو ہاتھ سے پکڑا اور اسے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے کوٹھے میں لے آئی۔ پھر لوگ ادھر بیگماں کی کوٹھری میں داخل ہوئے ادھر بانو نے یونس کے کوٹھے کا دروازہ بند کر دیا اور وہ یونس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہانپتی ہوئی بولی "فکر نہ کرو منشی جی! جب تم چھپر سے لکڑی کھینچ کر بھاگے تو میں جانتی تھی تم کہاں جا رہے ہو، پھر جب لوگ دھم دھم سن کر باہر لپکے تو میں نے جا کر بیگماں کے دروازے کا کنڈا کھول دیا اور اسے بتا دیا کہ یہ منشی جی کا کام کر رہی ہوں جو پچھواڑے میں تمہاری دیوار کوٹ رہا ہے۔ میں وہاں سے راجے کو نکال کر باہر سے کنڈا لگا آئی ہوں۔ اب اللہ نواز آئیگا تو کوٹھے میں بہن کو اکیلا دیکھ کر بیگماں سے کچھ نہیں کہے گا۔ اب تو اس کی زبان ان لوگوں پر اٹھے گی جن پر بیگماں نے سو بار تھوکا ہے اور جو آج اس سے بدلہ چکانے آئے ہیں"

بوکھلائے ہوئے یونس نے ایک لمبی گہری سانس لیکر بانو کی طرف دیکھا اور پیار سے اس کے سر پہ

Join eBooks Telegram

ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ سمجھ اور نہ سمجھے بغیر بولا "تم تو بڑی اچھی نکلیں بانو!"

لالٹین کی روشنی میں بانو حیران سی ہو کر یونس کی طرف ٹُک ٹُک دیکھنے لگی۔ پھر وہ ایکدم پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور یونس سے چمٹ گئی، وہ اپنا چہرہ اس کے سینے پر رگڑتی رہی اسکی گردن اور تھوڑی کو چومتی رہی، اسکے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر انھیں کھینچتی رہی اور کہتی رہی، "یوں بھی تو ہوتا ہے منشی جی تم بیگماں کو چاہتے ہو میں تمھیں چاہتی ہوں۔ تم نے بیگماں کی مدد کرنا چاہی، میں نے تمھاری مدد کر دی میں نے تو تمھاری نیندوں پر پہرے دئے ہیں میں راتوں کو ان کواڑوں کو چومتی پھری ہوں منشی جی۔ مجھے تو تمھاری ایک ایک گھڑی کا پتہ ہے کہ تم کیا کر رہے ہو اور کہاں دیکھ رہے ہو، میں نے ان جھریوں پر گال رکھ کر تمھاری سانسوں کی آوازیں سنی ہیں اور تم مدرسے گئے ہو تو تمھارے قدموں کی خاک اٹھا کر اپنی مانگ میں ڈال لی ہے، بس تم سے کچھ نہیں مانگتی منشی جی، میں تو اب عمر بھر اس ایک پل کو اپنے سینے سے لگائے لگائے پھروں گی، تم بیشک بیگماں کو چاہو، میں کون ہوتی ہوں روکنے والی، میں کوئی تمھاری پڑوسن ہوں ——"

بت کی طرح کھڑے ہوئے یونس کے دماغ کی سنسناہٹ گولوں کی طرح پھوٹ پڑی اور یونس کے۔

کواڑوں پر ایک ساتھ بہت سے ہاتھ پڑے

باہر ایک ہجوم جمع تھا اور بہت سے لوگ بیک وقت بول رہے تھے "ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ منشی جی کا دروازہ کھلا تھا اور ہم سامنے سے گزرے تو بند ہو گیا۔ یہ منشی کیا کرتا پھرتا تھا کیوں چھپا پھرتا تھا۔ ہم کہتے ہیں راجے کو اسی نے بھگایا ہے ہم اس سے پوچھیں گے۔ ہم گلے میں پھندا ڈال کر پوچھیں گے"

"پھندا ڈال کر پوچھنے کی تو خیر تمھیں مجال نہیں" ایک اور آواز آئی۔ "مگر تم نے میری بہن کی عزت کو تماشہ بنایا ہے تو منشی سے بھی پوچھ دیکھو۔ پھر میری تبر تم سے پوچھے گی منشی! ابھی دروازہ کھولو"

بانو منشی سے یوں چمٹ گئی تھی جیسے اس کی پسلیوں کو توڑ کر اندر گھس جانا چاہتی ہے

"دروازہ کھولو منشی۔ اللہ نواز پکارا!

یونس نے پہلی بار بانو کے گرد اپنا ایک بازو لپیٹا اور اس کے بالوں کو چوما، پھر وہ بانو کو آہستہ سے الگ کر کے اور اسے پلنگڑی پر بٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا تو کسی نے دروازے پر زور سے ایک لات

Join eBooks Telegram

ماری۔ اور پھر اکٹھے بہت سے آدمیوں نے زور لگایا اور دروازہ چوکھٹے سمیت سمٹ کر دھڑاک سے یونس کے قدموں میں آن گرا

اللہ نواز ہاتھ میں تبر تھامے اندر آیا اور ذرا سا رک جیسے بلند آواز میں سوچا " یہ کون ہے ؟ " ۔ پھر کڑک کر بولا۔ " تو کون ہے ؟ ۔ پھر باہر سے لوگوں سے پوچھا " تم نے تو کہا تھا منشی کنوارا ہے پھر اندر یہ عورت کون ہے ؟ "

لوگوں نے یلغار بول دی

پھر پھوٹتی ہوئی پو کے اجالے میں جب عطر کی تیز خوشبو سے فضا مہک رہی تھی اور بوڑھی نورانی جیسیوں عورتوں میں گھری ہوئی اور گھٹنوں میں سر چھپا کر بیٹھی ہوئی بانو کی پیٹھ پر دو ہتڑ مار رہی تھی اور اپنے مست الست کے بین کر رہی تھی، منشی اللہ یار ہجوم کو چیرتا ہوا آیا اور یونس کے سامنے ایک لمحے تک چپ چاپ کھڑے رہنے کے بعد ہر لفظ کو چباتا ہوا بولا۔ " یونس صاحب! مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی "

یونس یوں تڑپ کر اک خاموشی سے مار کھاتی ہوئی) بانو تڑپ کر کھڑی ہو گئی اور ڈیوڑھی کے دروازے پر کھڑی ہوئی بیٹیاں یوں بیٹھ گئی جیسے گر پڑی ہو پھر وہ گھٹنوں میں سر چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور سورج ابھرنے تک یہ خبر گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم گئی کہ بانو یار اُن کے ساتھ پکڑے جانے کے بعد ماسٹر یونس پر جن آگئے ہیں

ہندوستان بھر میں اپنی نوعیت کا واحد ہفت روزہ

آثار (باتصویر) کلکتہ

صوری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے منفرد۔ مضامین، ریاضی، سائنس، نسائیت، جنسیات، جرائم سال میں ۵۲ اشاعتیں سالانہ خریداری ۱۹ روپے

مستقل عنوانات " اپنے وطن میں " ملکی واقعات و مسائل پر بیباک بے لاگ تبصرہ " دیس پردیس " ایسی بین الاقوامی خبریں جو عام طور پر اخبارات میں نہیں ہوتیں " شخصیات " مشاہیر عالم کے بارے میں پر از معلومات مقالے

پتہ: منیجر ہفت روزہ آثار نمبر ۵ فیرس لین کلکتہ نمبر ۱۲

Join eBooks Telegram

سید قاسم محمود

[ریڈیائی تمثیل]

ایک شہر آرزو

کردار

باپ

ماں

بیٹا

بہو

بیٹے کا دوست

اس گھرانے کی ایک نوجوان رشتہ دار

بیٹا :- (اپنا ناول لکھتے ہوئے یہ مصرع گنگنا رہا ہے) ؏ دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے

بہو :- (قریب آتے ہوئے) ارے یہ کیا آج صبح ہی صبح ناول لکھنے بیٹھ گئے

بیٹا :- کیا وہ جاگ گیا ہے ؟

بہو :- وہ کون ؟ ــــــ حبیب ؟ ــــــ مجھے کیا معلوم

بیٹا :- میں سمجھا تم اسی کے پاس گئی ہو

بہو :- (غصّے سے) کچھ شرم کرو

بیٹا :- شرم کی کیا بات ہے، وہ میرا اصد دوست ہے۔ تمھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے اس سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ آجکل عجیب غریب الجھنوں میں گرفتار ہے۔ خیر خوش نصیبی نے ساتھ دیا تو نکل ہی جائے گا

Join eBooks Telegram

بھو :۔ وہ واقعی ہمدردی کے قابل ہیں۔ بڑے دکھی ہیں بیچارے۔ لیکن کبھی کبھی وہ مجھے بڑے عجیب
اور پراسرار معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً پچھلے سال ہی کی بات یاد کرو وہ کس طرح اچانک یہاں سے چلے
گئے تھے ہمیں الوداع تک نہ کہا، اپنی چیزیں تک نہیں

بیٹا :۔ میرا خیال ہے وہ نزہت کی محبت میں مبتلا ہو گیا تھا

بھو :۔ کیا واقعی ؟

بیٹا :۔ ہاں اس وقت میرا یہی خیال تھا۔ امی کہتی تھیں وہ واپس اپنے بیوی بچوں کے پاس
چلا گیا ہے

بھو :۔ (حیران ہو کر) تو کیا حبیب نے اسے طلاق نہیں دی تھی ؟

بیٹا :۔ طلاق تو یہاں سے جا کر دی تھی

بھو :۔ کیا واقعی تمہارا خیال یہ تھا کہ وہ نزہت سے محبت کرتا ہے ؟ تو پھر تم نے اس سے پہلے مجھے
کیوں نہیں بتایا ہے ——— بہر حال اگر وہ شادی کر لیں تو اچھا ہی ہے۔ بڑا مناسب جوڑا ہے۔

بیٹا :۔ نزہت تو کچھ یونہی سی ہے ——— بہت ہی مریل سی، بالکل بے جان !

بھو :۔ تم نزہت کو کیا جانو !

بیٹا :۔ وہ خوبصورت تو بہت ہے، لیکن اس میں حرارت وارت نہیں ہے

بھو :۔ ممکن ہے تمہاری بات صحیح ہو

بیٹا :۔ ممکن کیا بالکل صحیح کہہ رہا ہوں

بھو :۔ اسے اگر اظہار کا موقع دیا جائے تو شاید ....

بیٹا :۔ (بات کاٹ کر) کیا مطلب ؟

بھو :۔ معلوم ہوتا ہے، تم اس میں خاصی دلچسپی لیتے ہو

بیٹا :۔ ایک اعتبار سے

بھو :۔ کس اعتبار سے ؟

بیٹا :۔ تمہیں پتا ہی ہے۔ میرے اس ناول کی ہیروئن جمیلہ دراصل نزہت ہی ہے، میں اس کی
محرومیوں کو ......

Join eBooks Telegram

بہو:۔ (بات کاٹ کر) ہشت، امی جان آ رہی ہیں

بیٹا:۔ (آنیوالے کو مخاطب کر کے) امی! آج تو آپ بالکل اباجان کی طرح اچانک آ دھمکی ہیں ——— اب تو آپ سے بھی ڈر لگنے لگا ہے

ماں:۔ جمیل میاں! تم بڑے شریر ہو

بہو:۔ شریر تو کیا، بدتمیز ہیں ——— (لہجہ بدل کر) امی جان! یہ آپ ٹوکری میں کیا لائی ہیں؟

ماں:۔ صبح اٹھتی ہوں تو دیکھتی کیا ہوں کہ میری چمپو میاؤں میاؤں کرتی ہوئی کوٹھی سے نکل کر سڑک پر چلی گئی میں اسے پکڑتے پکڑتے مارکیٹ نکل گئی، چمپو وہاں ایک مرغیوں کے ڈربے میں گھس گئی۔ میں نے شرمندگی چھپانے کیلئے یہ جوڑہ خرید لیا

بیٹا:۔ گویا آج کا ناشتہ خوب بارونق رہے گا

ماں:۔ اور مفت میں تمہارے دوست کی دعوت بھی ہو جائے گی

بیٹا:۔ چلو جو چاہو سمجھ لو بات تو ایک ہی ہے

ماں:۔ کیوں جمیل، سنا ہے وہ تمہارا حبیب رات کو پھر یہاں آ گیا؟

بیٹا:۔ (طنزاً) وہ شاہدہ کا حبیب ہے۔ یہ اس کے آنے پر کچھ ضرورت سے زیادہ ہی خوش نظر آ رہی ہیں۔ رات کو وہ کوئی بارہ بجے آیا تھا اسکی آواز سنتے ہی شاہدہ اس کے استقبال کیلئے ایسی دوڑی کہ.........

ماں:۔ (ٹوکا) جمیل ایسے مذاق کی ضرورت نہیں بچے مت ہو جو آگ سے کھیلتے ہیں ان کے ہاتھ جل جاتے ہیں۔

بیٹا:۔ مجھے معلوم ہے لیکن میں آگ سے کھیلوں گا تو میرے ہاتھ نہیں جلیں گے کیونکہ میں بچہ نہیں ہوں ——— اور یوں بھی مجھے کسی سے جلنے کی کیا ضرورت ہے، کیا آپ کو مجھ میں جلن کے آثار نظر آ رہے ہیں

ماں:۔ جلن کے آثار ہمیشہ نظر نہیں آیا کرتے......... کیوں شاہدہ ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟

بہو:۔ خدا جانے آپ لوگ کیسی باتیں کرتے رہتے ہیں

ماں:۔ (آہ بھر کر) شاہدہ! تمہیں اس گھر میں نہیں آنا چاہئے تھا ——— بہرحال تم اپنی طرف سے غیر ذمہ داری نہ دکھانا!

Join eBooks Telegram

بیٹا: آپ کی شاہدہ تو بالکل فرشتے کی طرح معصوم ہے ـــــ مجھے تو ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں آپ اس کا دماغ خراب نہ کر دیں۔

بہو: آپ دونوں کا مذاق کرنے کا انداز ایسا خوفناک ہے کہ پتا ہی نہیں چلتا آپ کب سنجیدہ ہوتے ہیں اور کب ....

بیٹا: میں تو ہمیشہ سنجیدہ رہتا ہوں

بہو: ہاں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ تم ڈینگ مارتے وقت کبھی نہیں ہنستے

ماں: میرا خیال ہے، آج تم دونوں کا دماغ بگڑا ہوا ہے .... واہ صبح ہی الجھنے لگے ...... لیکن تم مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہو میں تو چلتی ہوں کہیں تمہارے ابا نہ آ جائیں اور خواہ مخواہ مجھے جھڑکیاں پڑیں

بیٹا: کہاں گئے وہ؟

ماں: ہوا خوری کیلئے باغ میں گئے ہیں اور کہاں گئے ہیں (لہجہ بدل کر، جاتے ہوئے) مجھے تو بیچاری شاہدہ پر ترس آتا ہے .... ایسا گھر نہ ملا ہے غریب کو کہ ....

بہو: (اپنے آپ پر ترس کھاتے ہوئے) ہاں سچ کہتی ہو اگر میں جمیل کو نہ جانتی اور یہ نہ جانتی کہ ادیب لوگوں کے کچھ اپنے قوانین ہوتے ہیں جو انہی سے مخصوص ہوتے ہیں تو شاید یہاں سے کبھی کی چلی گئی ہوتی

بیٹا: بڑی ناشکر گزار ہو شاہدہ، تم اس گھر میں اصل میں ان لوگوں کے ساتھ رہ رہی ہو جو دنیادار ہیں

ماں: لیکن ہم دنیاداروں میں تم ایک ادیب پتا نہیں کہاں سے آگئے۔ تم تیس برس کی عمر کو پہنچنے کے باوجود آج اپنی روزی خود نہیں کما سکتے تمہاری عمر میں تمہارے باپ نے سوکھی زمین پر یہ کوٹھی کھڑی کر دی تھی،

بیٹا: بہر حال کوئی کسی کا اکلوتا بیٹا یونہی تو نہیں بن جاتا آخر اسے اکلوتے پن کا کوئی نہ کوئی فائدہ تو ہونا ہی چاہیئے اور کچھ نہیں تو یہی سہی کہ وہ بیکار بیٹھا ناول لکھتا رہے اور باپ کے ٹکڑوں پر پلتا رہے

ماں: اچھا بھائی! مجھ سے تو یہ فلسفہ مت بگھارو میں تو چلی یہاں سے یہ الجھی الجھی باتیں اپنی بیوی ہی سے کیا کر (چلی جاتی ہے)

بیٹا: یہ گھر تو بالکل جہنم بنا ہوا ہے۔ میری روح ہر وقت ایک ان دیکھی آگ میں جلتی رہتی ہے ....

بہو: بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ میرا خیال ہے ہم دونوں کی محبت ہی ہے جو ہم اس گھر میں رہ رہے ہیں ورنہ اس بارود خانے میں میرا تو دم گھٹ جاتا جب کبھی مجھے یہ خیال آجاتا ہے میں اور تم ان کے ٹکڑوں پر

Join eBooks Telegram

بڑے ہوئے ہیں تو بڑی کوفت ہوتی ہے اور جب کبھی یہ سوچتی ہوں کہ ہمارا بھی اپنا ایک گھر ہوگا تو دل خوشی کے مارے بے قابو ہو جاتا ہے

بیٹا: لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ہم بیکاروں کو مفت کی روٹی دینے سے انھیں کتنی خوشی ہوتی ہوگی جب ہم چڑیوں کو باجرہ ڈالتے ہیں تو انھیں کھاتا دیکھ کر ہم کتنے خوش ہوتے ہیں

بہو: اچھا اب چپ رہو، بڑے میاں آ رہے ہیں۔ خدا کے واسطے انھیں ذرا ٹالتے رہنا ورنہ صبح ہی صبح جھگڑا کھڑا ہو جائے گا

بیٹا: میرے نفیس طنز و مزاح سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ان میں بہت کم ہے بہر حال اپنی سی بہتری کوشش کروں گا

باپ (دانک کے بالکل قریب آکر ٹھٹھرتے ہوئے) اوہو آج تو بہت سردی ہے

بیٹا: میں دیکھ رہا ہوں۔

باپ: تم سردی کو کیسے دیکھ سکتے ہو

بیٹا: میں کم از کم اتنا تو دیکھ ہی سکتا ہوں کہ آپ کانپ رہے ہیں؛

بہو: (سرگوشی میں شوہر سے) جمیل گستاخی مت کرو

باپ: گستاخی کیوں نہیں کرے گا۔ بات یہ ہے کہ حماقتیں کرتا تو ہے بے وقوف لیکن ان کی سزا بھگتتا ہے بے وقوف کا باپ!

بیٹا: پتا نہیں آپ کو یہ نئے نئے محاورے کہاں سے مل جاتے ہیں؟۔۔۔ ارے ہاں نزہت کہاں ہے؟

بہو: وہ برآمدے کی صفائی کر رہی ہے۔

باپ: سو عقلمند عورتیں مل کر ایک گھر بناتی ہیں اور ایک بیوقوف عورت اس گھر کو برباد کر دیتی ہے

بیٹا: کیا تمھارا اشارہ شاہدہ کی طرف ہے

باپ: جی نہیں، اس مہمان کی طرف جو کل رات یہاں پھر آیا ہے۔

بیٹا: آپ کو اس کا خیال بہت دیر میں آیا

باپ: مجھے کسی کا خیال کرنے کی کیا ضرورت ہے، میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اس گھر میں آنے والے مہمانوں کو مناسب وقت پر دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے۔ سمجھے!

Join eBooks Telegram

بیٹا :۔ سمجھا

باپ :۔ کیا اسے تم نے بلایا تھا؟

بیٹا :۔ اگر آپ کو اس کا یہاں آنا گوارا نہیں تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا

باپ :۔ جونہی میں تم سے کوئی بات پوچھتا ہوں تم فوراً یہاں سے چلے جانے کا ڈراوا دیتے ہو حالانکہ تمھیں معلوم ہے کہ یہ گھر میں نے تمہارے لئے ہی بنایا تھا تمہارے سوا اور ہے کون جو یہاں رہے گا، جہاں تک میرا تعلق ہے، میری عمر میں آدمی ہمیشہ دوسروں کے سہارے زندہ رہتا ہے

بیٹا :۔ آپ ابھی اتنے بوڑھے نہیں ہوئے، آج صبح جب آپ ہواخوری کو نکلے تھے تو آپ نے بالکل جوانوں کی طرح اپنے کوٹ پر گلاب کا پھول لگایا تھا۔

باپ :۔ (غصے سے) مذاق کی بھی ایک حد ہوتی ہے

بہو :۔ آپ محسوس نہ کیجئے میں اچھی طرح جانتی ہوں جمیل کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور

باپ :۔ اگر جمیل کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور تو جمیل بے وقوف ہے، احمق ہے، گدھا ہے ...... (لہجہ بدل کر) وہ سامنے اوپر والے کمرے کی کھڑکی میں کون ہے؟

بیٹا :۔ دہی ہے، میرا، آپ کا، اس گھرانے کا دوست

باپ :۔ کافی بدل گیا ہے

بیٹا :۔ بظاہر تو ویسے کا ویسا ہے

باپ :۔ جس آدمی کا کوئی مذہب نہ ہو وہ پچاس فیصد برا ہوتا ہے اور جو آدمی اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے وہ سو فیصد برا ہوتا ہے

بہو :۔ خیر یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے

باپ :۔ ایک زمانہ تھا کہ جب حبیب کے طلاق دینے کا مسئلہ چھڑتا تھا جمیل آگ بگولا ہو جاتا تھا اور اسے گالیاں دیتا تھا، اسے خط لکھا کرتا تھا اسے سمجھایا کرتا تھا، لیکن اب جمیل اس مسئلہ پر کتنا خاموش رہتا ہے

بیٹا :۔ اس لئے کہ میں پہلے اسے سمجھا نہیں تھا اور اب میں اسکی رگ رگ سے واقف ہوں

باپ :۔ لو اب اسی خوشی میں ایک نیا محاورہ سن لو ـــــ اگر محبت کا ایک دن ہوتا ہے تو نفرت

Join eBooks Telegram

ی ایک دن ہوتا ہے ـــــــ اچھا خدا حافظ! (چلا جاتا ہے)

بیٹا : ہاں تو میں کہہ رہا تھا، اگر میں نزہت کی شادی حبیب سے کرا دوں تو کیسا رہے؟

بہو : حبیب اتنی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں ہے

بیٹا : مگر وہ تمام رنڈوؤں کی طرح جلد بھڑکنے والا تو ہوگا!

بہو : مگر وہ نزہت سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے

بیٹا (جل کر) کہیں زیادہ خوبصورت! ـــــــ جب سے وہ آیا ہے یہاں کی فضا عجیب ہوگئی ہے
سا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی طوفان آنے والا ہے۔ مجھ میں بار بار یہ خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ یہاں سے
ہیں دور چلا جاؤں

بہو : لیکن تم ابھی اتنے بڑے ادیب نہیں ہوئے کہ یہ ناول فروخت کر سکو، اگر ہم کہیں اور چلے جائیں
کھائیں گے کیا۔ تمھارے والد تو کچھ دیں گے نہیں۔ میرا خیال ہے تم حبیب سے مشورہ کرو وہ لوگوں کو مشکلوں
نکالنے میں بڑا ملکہ رکھتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ خود اپنی مشکلوں سے نجات نہیں پا سکتا

بیٹا : دوسرے لوگوں سے اپنے گھریلو معاملات میں مشورہ لینا ٹھیک نہیں ـــــــ

بہو : تو کیا تم اپنے واحد دوست کو غیر سمجھتے ہو؟

بیٹا : بہر حال وہ ہمارا رشتہ دار تو ہے نہیں ـــــ اس لیے ابا جان اکثر ایک محاورہ کہا کرتے ہیں
اپنے دوستوں سے اس طرح پیش آؤ جیسے وہ کل تمھارے دشمن ہو جائیں گے ....

بہو : یہ لو، وہ تمھارے دوست چلے آ رہے ہیں۔

بیٹا : (دوست سے) آیئے آیئے

دوست : میں نے سوچا آپ میرا انتظار کر رہے ہوں گے اس لئے میں چلا آیا۔

بہو : آپ ہی کا انتظار ہو رہا تھا

دوست : آج موسم کتنا خوشگوار ہے ـــــــ شاید اس لئے کہ مجھے آپ جیسے خوش نصیبوں کے ساتھ
بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔

بیٹا : تو کیا آپ ہمیں خوش نصیب سمجھتے ہیں؟

دوست : یقیناً ـــــ اور آپ کے والد تو آپ سے زیادہ خوش نصیب ہیں، گھر میں لڑکا ہے ایک

Join eBooks Telegram

چاند سی بہو ہے، ایک خوبصورت گل گوتھنا پوتا ہے، انہیں اور کیا چاہئیے، بڑھاپے میں یہ دولت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے

بیٹا :۔ (ہنس کر) صحت کرو بھائی

دوست :۔ میں تو تم لوگوں کی ہشاش بشاش زندگی دیکھکر خوش ہو رہا ہوں کہ شاید میں بھی ایک دن ایسی زندگی بسر کروں، آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ آپ کے والد نے کیسی کیسی مصیبتیں اٹھائی ہیں، غرض افلاس، جلاوطنی اور جانے کیا کچھ۔ ایک دفعہ تو انھیں برادری باہر کر دیا گیا تھا

بیٹا :۔ اور اب تو اللہ کے فضل سے ان کے پاس کافی جائیداد ہے، یہ کوٹھی ہے زمینیں ہیں، لڑکا بھی ماشاءاللہ بڑی اچھی جگہ بیاہا گیا ہے اور اس کی ازدواجی زندگی مسرتوں سے پر ہے

دوست :۔ اس میں کیا شک ہے

بیٹا :۔ دیکھو میاں حبیب تم میرے جگری دوست ہو اگر ایک سوال کروں تو جھوٹ تو نہیں بولوگے؟

دوست :۔ بالکل نہیں

بیٹا :۔ پچھلے سال جب تم یہاں آئے تھے تو کیا تمھیں اپنی بھابی سے محبت نہیں ہو گئی تھی؟

دوست :۔ او ہو، تم کیا گڑے مردے اکھاڑنے لگے۔

بیٹا :۔ تم یہاں سے اچانک غائب کیوں ہو گئے تھے۔

دوست :۔ یہ پرانا قصّہ ہے

بیٹا :۔ اچھا اگر وہ تمھاری بھابی نہیں تھی تو کیا وہ نزہت تھی؟

دوست :۔ ایک بار کہہ دیا ہے یہ پرانا قصہ ہے۔

بیٹا :۔ دیکھ لیا نا شاہدہ، میں کہتا نہیں تھا وہ سب نزہت کی وجہ سے ہوا تھا

بہو :۔ لیکن انھیں اس لڑکی سے اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت تھی

دوست :۔ میں ڈرا تو کسی بھی نہیں تھا

بیٹا :۔ تو پھر تمھیں بھاگ جانے کی عادت ہو گی!

دوست :۔ یوں تو ہر آدمی کبھی ڈرتا بھی ہے...... اور کبھی اسے بھاگنا بھی پڑتا ہے

بیٹا :۔ پتا ہے، ابھی ابھی اباجان تمھارے متعلق کیا کہہ رہے تھے؟

Join eBooks Telegram

بہو : (شوہر سے سرگوشی میں) جمیل کیا کرتے ہو؟

بیٹا : کہتے تھے، حبیب خاصا بدل گیا ہے

دوست : ٹھیک ہی کہتے ہیں، دراصل میں بڑا ہی بدنصیب ہوں!

بہو : آپ ہمیشہ اپنی بدنصیبی کا ڈھنڈورا کیوں پیٹتے رہتے ہیں؟

دوست : شاید اسے چھپانے کے لئے

بیٹا : میرا مشورہ مانو تو تم دوسری شادی کر لو! سب ٹھیک ہو جائے گا

دوست : سب ٹھیک ہو جائے گا؟ ...... اور دوسری شادی کروں بھی تو کس سے

بیٹا : مثال کے طور پر نزہت سے۔

دوست : (غصے سے) جمیل! پھر وہی قصہ!

بیٹا : (قہقہہ مار کر) دیکھ لیا نا، پانی ہمیشہ نشیب میں مرتا ہے ــــ وہ یقیناً نزہت تھی

دوست : اچھا اب میں چلتا ہوں ذرا غسل کر آؤں، کپڑے بدل لوں

بیٹا : کپڑے بدلنے کی ضرورت کیا ہے میاں، تم تو ان کپڑوں میں بھی کافی خوبصورت نظر آ رہے ہو کم از کم نزہت تو تمہیں چاہ ہی سکتی ہے نا ....

دوست : دیکھا بھابی آپ نے آج آپ کے شوہر نامدار نے بھی مجھے خوبصورت تسلیم کر لیا ہے .... اچھا تھوڑی دیر کے لئے خدا حافظ! پھر میں ناشتے کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا!

بہو : کیا کہا؟ کہاں چلے جائیں گے آپ؟ ہمارے پاس نہیں رہیں گے کیا؟

دوست : نہیں۔ میں اس مرتبہ اس خیال سے نہیں آیا تھا

بیٹا : کیوں آخر اس مرتبہ کیا تبدیلی آگئی ہے؟

دوست : کوئی خاص بات نہیں ــــ بس ویسے ہی ــــ میں آپکی پرامن زندگی میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا ....

بہو : کہاں رہیں گے آپ؟

دوست : کسی ہوٹل میں چلا جاؤں گا

بہو : کیا آپ ہم سے ایسے ہی بیزار ہیں، لوگ کیا کہیں گے کہ جمیل کا دوست حبیب کبھی کبھار یہاں آتا!

Join eBooks Telegram

ہے تو ہوٹل میں رہتا ہے، طرح طرح کی باتیں بننے لگیں گی

دوست :۔ باتیں ؛ کیسی باتیں ؟

بہو :۔ آپ جانتے ہی ہیں جتنے منہ اتنی باتیں، کتنے کی زبان نہیں پکڑی جاتی ہے

بیٹا :۔ نہیں حبیب تمہیں یہیں ٹھہرنا چاہئے، اگر تم ہوٹل میں رہے تو یہ سمجھا جائیگا کہ میرا تمہارا جھگڑا ہے

دوست :۔ لوگوں کی رائے سے ہمارے لئے کیا فرق پڑتا ہے

بیٹا :۔ ضرور کوئی ایسی خفیہ بات ہے جو تم ہم سے چھپانا چاہتے ہو........ تمہارے دل میں چور ہے جو

دوست :۔ سچ بات یہ ہے کہ...... لیکن سچ بات کہنے کی میں جرأت کہاں رکھتا ہوں.... سچ بات یہ ہے کہ

بیٹا :۔ سچ بات کی ہمیں ضرورت نہیں ہے سچائی سے الجھنیں بڑھتی ہیں ـــ بہرحال فیصلہ ہوگیا تم یہیں رہو گے ـــ میں ذرا شیو کر آؤں، ابھی آتا ہوں (چلا جاتا ہے)۔

بہو :۔ اور میں ذرا باورچی خانے کا حال معلوم کر آؤں

دوست :۔ گویا میں یہاں اکیلا بیٹھا رہوں گا ؟

بہو :۔ آپ کے پاس نزہت رہے گی ـــ (ذرا بلند آواز سے) نزہت دیکھو تم حبیب صاحب کے پاس بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں (چلی جاتی ہے)

دوست :۔ نزہت میں تم سے ایک خاص بات کرنا چاہتا ہوں تم اس گھرانے کی فرد ہو اور شاید سب سے ذہین، تم یہاں کے سب رازوں سے واقف ہو ـــ وعدہ کرو کہ تم میری باتیں اپنے دل میں رکھو گی

رشتہ دار :۔ وعدہ کرتی ہوں!

دوست :۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ میں اپنے دوست جمیل اور اپنی بھابی کا کس قدر احترام کرتا ہوں ـــ اوہو، تم مسکرا رہی ہو۔ میں تمہاری مسکراہٹ کا مطلب سمجھتا ہوں، لو میں صاف صاف سب کچھ بتائے دیتا ہوں، تم جانتی ہی ہو کہ شاہدہ میں کس قدر جاذبیت ہے، میں بھی اس کی جاذبیت کا شکار ہوں، لیکن اللہ کا احسان ہے کہ مجھے اپنے جذبات پر قابو رکھنا آتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی مجھے دو لمحے کیلئے میں اپنے جذبات کا غلام بن جاتا ہوں مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ........

رشتہ دار :۔ (بات کاٹ کر) مجھے معلوم ہے کہ شاہدہ میں بڑی کشش ہے، یہ بھی جانتی ہوں کہ اسکی کشش آپ تک پہنچ چکی ہے ـــ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آپ جمیل صاحب سے اسقدر مرعوب

Join eBooks Telegram

کیوں رہتے ہیں؟

دوست: شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پاس رہ کر مجھے ہمیشہ سکون ملتا ہے۔ مجھ میں یقیناً کوئی ایسی کمزوری ہوگی جو اس کی موجودگی میں طاقت بن جاتی ہے ـــــ حالانکہ وہ میرے سامنے بالکل بچہ ہے!

رشتہ دار: بچوں کے ساتھ کھیلنے میں واقعی مزہ آتا ہے، لیکن آپ تو اس بچے سے بیزار ہی نہیں ہوتے

دوست: تعجب ہے، آپ کیسی کیسی نازک باتیں سوچتی رہتی ہیں ـــــ میرے دماغ میں تو کبھی اس کا خیال تک نہیں آیا....... آپ نے کیا سوچا ہے؟

رشتہ دار: میں نے تو یہ سوچا ہے کہ آپ شاہدہ سے محبت کر رہے ہیں یا کہہ لیجئے کہ اس کی کشش کا شکار ہو گئے ہیں۔

دوست: نہیں ایسا نہیں ہے، میں انھیں اس وقت زیادہ چاہتا ہوں جب وہ اکھٹے ہوتے ہیں جب ان میں کوئی مجھے تنہا ملتا ہے تو مجھے اتنی خوشی نہیں ہوتی جتنی ان دونوں کی موجودگی میں ہوتی ہے، اگر ان میں سے کوئی مجھے تنہا ملتا ہے تو وہ میرے لئے بالکل اجنبی ہوتا ہے ـــــ اور فرض کیجئے آپ کا خیال ٹھیک ہے یعنی یہ کہ میں شاہدہ سے محبت کرتا ہوں تو میرے لئے بہتر کیا ہے؟ میں اپنے جذبے کو چھپائے رکھوں یا اظہار کر ڈالوں، آپ کا کیا خیال ہے؟

رشتہ دار: جذبہ اپنے اظہار کا راستہ خود جانتا ہے۔ جذبہ تو آگ ہے پھیلتا ہی چلا جاتا ہے

دوست: ہاں آگ سمٹتی بھی ہے تو اس وقت جب وہ بجھ جاتی ہے ـــــ آپ جانتی ہی ہیں کہ میں پہلی شادی اور طلاق کے چکر سے بڑی مشکل سے نکلا ہوں، اب میں کوئی نیا کھیل نہیں کھیل سکتا ـــــ اور یوں بھی، شاہدہ اپنے ناول نگار شوہر سے محبت کرتی ہے

رشتہ دار: اس نے کبھی جمیل سے محبت نہیں کی ان کی محبت ایک سیدھی سادی ازدواجی محبت ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں

دوست: میرا خیال ہے آپ بھی یقیناً کسی محبت کرتی ہیں یا کر چکی ہیں

رشتہ دار: آپ کو یہ خیال کیسے آیا؟

دوست: آپ کی باتوں سے تجربہ جھلک رہا ہے ـــــ اسی لئے اب میں کچھ اور گہری باتیں پوچھوں گا ـــــ اب کے میں یہاں آیا ہوں تو مجھے بہت سی تبدیلیاں نظر آ رہی ہیں حالات میں بھی اور

Join eBooks Telegram

لوگوں میں بھی ....

رشتہ دار: رسشلاً

دوست: مثلاً یہاں کی مختلف فضا، مختلف ماحول، مختلف انداز گفتگو ـــــ ضرور کوئی ایسی بات ہے جو میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے

رشتہ دار: ہاں یہ عجیب گھرانہ ہے باپ نے اپنی جوانی میں لاکھوں روپیہ کمالیا تھا۔ پندرہ برس سے بیٹھا کھا رہا ہے، زمینوں کی آمدنی آجاتی ہے، مکانوں کا کرایہ الگ۔ بیٹا نکھٹو ہے۔ تصویریں بنا تا رہتا ہے یا کاغذ کالے کرتا رہتا ہے، سب کے سب صبح سورج کے ساتھ اٹھتے ہیں، کھاتے ہیں پیتے ہیں اور ہنستے کھیلتے شام کو سورج کے ساتھ سو جاتے ہیں، دن انتہائی مزے سے کٹتے ہیں، موت کا انتظار ہے نہ پروا ان کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں کوئی خواہش نہیں۔ یہ تو آسمانی لوگ ہیں زمین کے باشندوں کی کوئی بات ان میں نہیں ملتی

دوست: کمال ہے آپ کو اپنے خیالات پر کتنی قدرت ہے ـــــ اور آپ کا مشاہدہ کتنا گہرا اور تیز ہے

رشتہ دار: میں ان سے نفرت جو کرتی ہوں

دوست: اپنے آپ سے، جو اتنی شدید نفرت کرتا ہے وہ شدید محبت بھی کر سکتا ہوگا اور محبت سے، آپ ان سے نفرت کیوں کرتی ہیں

رشتہ دار: میں اس گھر کے مالک کی سگی بھتیجی ہوں، جب میرے ابا کا انتقال ہوا تھا تو میں بالکل ذرا سی بچی تھی، چچا ہی نے میری پرورش کی، کہتے ہیں کہ جب میرے ابا بستر مرگ پر لیٹے ہوئے آخری بار چچا سے بات کر رہے تھے تو انھوں نے وصیت کی تھی کہ میری شادی جمیل سے کی جائے، شروع ہی سے چچا مجھے اپنی بہو سمجھا ہے اور میں شروع ہی سے جمیل سے محبت کرتی آرہی ہوں ـــــ اب تک، اس لمحہ تک، جوان ہونے پر جب شادی کا مرحلہ آیا تو جمیل پتا نہیں، یہ شاہدہ کہاں سے پکڑ لائے، وہ کہتے ہیں کہ شاہدہ ان کی داخلی زندگی سے پوری طرح واقف ہے ....

دوست: اب جبکہ ہم نے اپنے اپنے دل ایک دوسرے کے سامنے کھول کر رکھ دئے ہیں کیوں نہ ہم ایک دوسرے کے راز دار بن جائیں

رشتہ دار: اگر میں نہ چاہوں تو۔

Join eBooks Telegram

دوست : تو آپ کی مرضی ——— لیکن خدارا اتنی شدید نفرت مجھ سے نہ کیجئے گا

رشتہ دار : (ہنس کر) ہاں یہ وعدہ کر سکتی ہوں

بہو : (قریب آتے ہوئے) معاف کیجئے میں نے آپ کی پر سکون باتوں میں دخل تو نہیں دیا؟

دوست : آیئے آیئے ——— یہاں کے سکون میں دخل دینے والا تو میں ہوں

بہو : لیجئے یہ کمبل اوڑھ لیجئے، آج بہت سردی ہے میں دراصل یہ کمبل ہی لینے گئی تھی۔

دوست : اگر مجھے معلوم ہوتا یہاں اتنی سردی پڑ رہی ہے تو گرم کپڑے ساتھ لیتا آتا

بہو : نزہت! ایک کام تو کرو ذرا انگیٹھی جلا لاؤ۔

دوست : نہیں میری خاطر کوئی تکلیف نہ کیجئے،

نزہت : (جاتے ہوئے) اس میں تکلیف کی کیا بات ہے

دوست : (خاموشی کے مختصر وقفے کے بعد) اس کے جاتے ہی کتنی خاموشی ہو گئی!

بہو : جب میں آئی تھی تو کچھ وعدے وعید ہو رہے تھے!

دوست : وعدے تو کیا، اپنا اپنا رونا رو رہا تھا

بہو : اس مرتبہ تو آپ کچھ زیادہ ہی پریشان ہیں، آخر کیا بات ہے، مجھے بتایئے تو سہی مجھ سے آپ کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی، آخر آپ مغموم کیوں ہیں

دوست : محض اس لئے کہ میں دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتا

بہو : اور آپ کام محض اس لئے نہیں کر سکتے کہ .... (رک جاتی ہے)

دوست : کس لئے؟

بہو : کیا آپ اب تک اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں؟

دوست : نہیں اس سے نہیں اس کی یادوں سے۔

بہو : ان یادوں کو دوبارہ تازہ کر لیجئے

دوست : کبھی نہیں!

بہو : کیا پچھلے سال آپ یہاں سے بھاگ کر اسی کے پاس گئے تھے

دوست : ہاں

Join eBooks Telegram

بہو :۔ وہ کس قسم کی عورت ہے؟

دوست :۔ نہایت شریف گھرانے کی نہایت شریف لڑکی!

بہو :۔ کیا آپ کو اس سے محبت تھی

دوست :۔ بہت زیادہ

بہو :۔ پھر

دوست :۔ پھر یک مجھے اس سے نفرت ہو گئی اور اسے مجھ سے نفرت ہو گئی!

بہو :۔ لیکن کیوں؟ ـــــ آخر کیوں

دوست :۔ یہ سوال زندگی کے ان بے شمار سوالوں میں سے ہے جن کا جواب نہیں دیا جاسکتا

بہو :۔ لیکن کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا

دوست :۔ ہاں میں خود بھی اس سبب کی کھوج میں رہتا تھا۔ میں نے یہ پایا کہ ہماری محبت کا جو سبب تھا وہی ہماری نفرت کا نتیجہ تھا، ہمارے اختلافات نے نااتفاقی پیدا نہیں کی ـــــ بلکہ ہوا یوں کہ جب محبت مرگئی نفرت پیدا ہو گئی، یہی وجہ ہے کہ وہ شادیاں کامیاب رہتی ہیں جو بغیر محبت کے کی جاتی ہیں

بہو :۔ ہماری شادی محبت کی شادی ہے لیکن کامیاب ہے مجھ میں اور جمیل میں کسی مسئلے پر کبھی اختلافات پیدا نہیں ہوئے

دوست :۔ شاہدہ! اس لئے کہ آپ ان سے محبت نہیں کرتیں!

بہو :۔ محبت! محبت کیا ہے

دوست :۔ محبت، ایک ایسی چیز ہے جسے بیان نہیں کیا جاسکتا

بہو :۔ کیا آپ کی بیوی بہت خوبصورت تھی؟

دوست :۔ بہت زیادہ ـــــ آپ سے ذرا کم

بہو :۔ تو کیا میں خوبصورت ہوں؟

دوست :۔ بہت ہی زیادہ!

بہو :۔ (خوش ہو کر) جمیل کو اس بات کا پتا اس وقت چلا جب پہلی مرتبہ آپ نے میری ان سے

Join eBooks Telegram

تعریف کی تھی ـــــ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آپ جونہی یہاں آتے ہیں وہ اچانک میرے شیدائی بن جاتے ہیں ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے اپنے سے جدا نہیں کرتے جیسے آپ کی موجودگی سے ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے

دوست :۔ کیا اسی لئے وہ میرے یہاں آنے پر اتنا خوش ہوتے ہیں اور ان سے زیادہ آپ ؟

بہو :۔ میں

دوست :۔ زیادہ گہرائی میں جانے سے کیا فائدہ ـــــ میرا خیال ہے اب ہمیں موضوع بدل لینا چاہئے

بہو :۔ (غصے سے) آپ کا مطلب کیا ہے، آخر آپ میرے متعلق کیا سوچتے ہیں ؟

دوست :۔ بھابی! کوئی خاص بات نہیں ـــ اگر آپ نے میری کوئی بات محسوس کر لی ہے تو معافی چاہتا ہوں

بہو :۔ آپ نے اپنی بات چھپا کر مجھے دکھ پہنچایا ہے

دوست :۔ نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے بھابی۔ آپ میرے نزدیک ....

بہو :۔ کیا؟ بولتے کیوں نہیں ؟

دوست :۔ میرے دوست کی بیوی ہیں اور اسی لئے ....

بہو :۔ اگر میں آپ کے دوست کی بیوی نہ ہوتی تو ؟

دوست :۔ اب ہمیں موضوع بدل لینا چاہئے ۔

بہو :۔ آپ مجھے بتائیے تو سہی میرے متعلق آخر آپ کیا سوچتے ہیں ؟

دوست :۔ یہی کہ آپ زندگی سے بہت کم لینا چاہتی ہیں کیونکہ آپ ایک قناعت پسند خاتون ہیں

بہو :۔ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں زندگی سے بہت کم لینا چاہتی ہوں ؟

دوست :۔ اس کا جواب میرا یہ سوال ہے کہ کیا آپ زندگی سے بہت کچھ لینا چاہتی ہیں؟ کیا آپ میں اس وسیع دنیا میں گھومنے پھرنے کی خواہش ہے؟ کیا آپ اپنے موجودہ مقام سے کچھ بلند بہت اوپر اٹھنا چاہتی ہیں آپ میں کچھ اور بننے کی آرزو ہے ؟

بہو :۔ نہیں بالکل نہیں، مجھ میں کوئی آرزو نہیں ہے ـــــ لیکن یہ اجیرن زندگی جس میں کرنے کے لئے کوئی کام نہیں خیر بات نہیں ـــــ یہ ٹھہری ہوئی ساکن جھیل، مجھے بالکل پسند نہیں۔

Join eBooks Telegram

کبھی کبھی بیحد مایوسی میں عجیب عجیب خیالات آتے ہیں، دل چاہنے لگتا ہے کہ کوئی زبردست طوفان آئے کوئی آندھی آئے کوئی بیماری پھیل جائے، کہیں زبردست آگ لگ جائے .... اور یہ نہیں تو میرا بچہ مرجائے .... میں خود مرجاؤں!

دوست: آپ جانتی ہیں یہ کیا ہے؟ بے کاری! آرام طلبی! خوشیوں کا حد سے گزر جانا اور......

بہو: اور کیا؟

دوست: اور محبت کرنے کی خواہش!

بہو: (غصے سے) کیا کہہ رہے ہیں آپ؟

دوست: میں دوبارہ اپنی بات کہنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ سن چکی ہیں۔

بہو: آپ دنیا کے سب لوگوں سے مختلف ہیں ...... مجھے کبھی کبھی آپ سے ڈر لگنے لگتا ہے .... آخر آپ کیا ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ آپ کی زندگی آخر ہے کیا؟ آپ ہر وقت پارے کی طرح بے چین سے کیوں رہتے ہیں

دوست: کیا آپ نے کبھی یہ محسوس کیا ہے آپ کے شوہر کی غیر موجودگی میں ہم دونوں لڑتے رہتے ہیں ...... یہ اچھی علامت نہیں ہے

بہو: کس بات کی علامت؟

دوست: اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کسی تیسرے آدمی کے بغیر بات بھی نہیں کرسکتے۔

بہو: آپ کا تبصرہ بڑا دلچسپ ہے!

دوست: اب تو موضوع بدلنا ہی پڑے گا ...... جمیل صاحب کہاں چلے گئے؟ ڈاکٹر صاحب دور جاکر وہ دیکھئے باغ میں ہیں قہقہے اڑائے جارہے ہیں

بہو: قہقہے تو یہاں کی عام بات ہے

دوست: لیکن اس سال یہ قہقہے کچھ بدلے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بارود کے گولے چھوٹ رہے ہیں سمجھ میں نہیں آتا اس سال اس گھر کو کیا ہوگیا ہے مجھے یہاں کی ایک ایک چیز سے خوف آرہا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس گھر کے نیچے ایک سرنگ کھودی گئی ہے جس میں بارود بھری ہوئی ہے ـــــ اب یہ معلوم نہیں کہ بارود بھری کس نے ہے اور اس میں فتیلہ لگانے والا کون ہوگا

Join eBooks Telegram

بہو : آپ کا وہم ہے، مجھے تو ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی سب کچھ پہلے کی طرح ہے، قہقہوں کا مطلب نکالنا بھی کوئی آپ سے سیکھے

دوست : ارے آپ نہیں جانتیں، آتش گیر مادہ ہمیشہ اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے پھر ایک دم بھڑک اٹھتا جاتا ہے اور کسی کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ کیا ہوا، کس نے آگ لگائی، ... میرا مشورہ مانیں تو آپ دیا سلائیوں سے کھیلنا چھوڑ دیں کبھی مذاق مذاق میں آگ آپ ہی کے ہاتھ سے لگ جائے گی

باپ : (قریب آتے ہوئے) ارے بھئی جمیل کہاں ہو؟

بہو : جی وہ ذرا باغ میں گئے ہیں آپ کو ان سے کوئی کام ہے؟

باپ : جبھی تو اسے پکار رہا ہوں، تم نے نزہت کو دیکھا ہے؟

بہو : نہیں کافی دیر ہو گئی، انگیٹھی جلانے گئی تھی

باپ : ارے حبیب میاں، معاف کرنا بھئی، میں نے دیکھا نہیں تھا، کیا حال ہے

دوست : اچھا ہے

باپ : مزاج کیسے ہیں؟ دوست : اچھے ہیں

باپ : خیریت تو ہے؟

دوست : جی ہاں، خیریت ہی ہے

باپ : کہیے اب کے کیسے آنا ہوا

بہو : اگر آپ کا کام میں کر سکتی ہوں مجھے بتائیے

باپ : شکریہ شکریہ ...... میں چلتا ہوں ...... معاف کرنا بھئی میں نے خواہ مخواہ ......

بہو : آپ کو ان سے کیا کام تھا؟

باپ : بات یہ ہے کہ میرے کمرے میں بے تحاشا مچھر ہیں، خدا جانے کہاں سے آگئے ہیں ..... اور مجھے آ رہی ہے نیند، چاہتا تھا تمھارے اوپر والے کمرے میں سو جاؤں

بہو : اوہ اوپر والے کمرے میں تو حبیب صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں

باپ : اچھا اچھا، تو حبیب صاحب یہیں ٹھہریں گے، معاف کرنا بھئی مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ قیامت تک بھی اپنی بات زبان سے نہ نکالتا ...... سچے دل سے معاف کر دینا بھئی

Join eBooks Telegram

دوست : (غصے کو دباتے ہوئے) میں قیامت تک اس گھر میں آنے جرأت نہ کرتا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ.........

باپ : ورنہ بھئی نہ میں آپ کے درمیان نہیں آنا چاہتا۔ کلہاڑی اور لکڑی کے درمیان آنے کا حشر ہوتا ہے، مجھے معلوم ہے....... (وقفہ) اچھا دیکھئے خدا کے واسطے جمیل سے کمرے کا ذکر نہ کیجئے ورنہ میرے پیچھے پڑ جائے گا

بہو : میں ان سے ذکر نہیں کروں گی، آپ بے فکر رہئے

باپ : دراصل میرا دماغ خراب ہو گیا ہے، خواہ مخواہ یہاں چلا آیا...... مجھے پتا ہوتا تو کیوں آتا....... اگر کمرہ خالی ہوتا تو دوسری بات تھی...... لیکن اب تو معاملہ ہی دگر ہے (چلا جاتا ہے)

دوست : بھابی! معاف کیجئے میں تھوڑی دیر کیلئے اجازت چاہتا ہوں

بہو : کہاں جا رہے ہیں آپ؟

دوست : یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں

بہو : مگر مجھے معلوم ہے...... آپ ہوٹل جا رہے ہیں.......... لیکن میں آپکو نہ جانے دونگی

دوست : (دور ہٹتے ہوئے) کیا اب بھی آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں یہاں ٹھہرا رہوں جبکہ مجھے جانے کا راستہ دکھایا گیا ہے

بہو : نہیں آپ یہاں سے نہیں جائیں گے ——— میں کہتی ہوں آپ بالکل نہیں جائینگے

بیٹا : (قریب آتے ہوئے) کہاں نہیں جائیں گے....... یہ کیا جھگڑا ہو رہا ہے آپ دونوں میں؟

بہو : دیکھو جمیل! یہ تمہارے دوست ہوٹل جا رہے ہیں محض اس لئے کہ ابا جان اوپر والے کمرے میں سونا چاہتے تھے۔

بیٹا : اوپر والے کمرے میں سونا چاہتے تھے....... میاں حبیب یہ تو ایسی کوئی بات نہیں ہے

بہو : (بچہ غصے اور حسرت کے ساتھ) حبیب صاحب!...... (خاموشی کے وقفے کے بعد) چلے گئے!...... یہ بڑے میاں بھی بیٹھے بٹھائے جانے کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے اس گھر کا چین غارت کر دیا ہے

بیٹا : میرا خیال ہے ان کی یہ عادت تمھیں برداشت کرنی چاہئے....... اور تمہیں کسی

Join eBooks Telegram

ذرا اپنے جذبات کو بھی چھپانے کی کوشش کرنی چاہئے

بہو :۔ کونسے جذبات ؟ .... کیا مطلب ہے تمھارا..... جذبات تو تمھیں چھپانے چاہئیں

بیٹا :۔ کونسے جذبات ؟

بہو :۔ رقابت اور کیا

بیٹا :۔ (ہنس کر) ارے نہیں شاہدہ میں تو ان غیر ہمدردانہ جذبات کی بات کر رہا تھا جو تم میرے والد کے لئے رکھتی ہو

بہو :۔ اچھا اب جذبات کی بات نہ کرو........ لو یہ ٹائی باندھ لو اور انسان نظر آؤ

بیٹا :۔ ہاں آج کے دن یہ سرخ ٹائی بڑی مناسب رہے گی۔ جذبات چھپانے کا کام دے جائیگی

بہو :۔ (ٹائی باندھتے ہوئے) مہمانوں کے سامنے تمھیں یہ میلے کچیلے کپڑے پہنتے ہیں آخر کیا مزہ آتا ہے

بیٹا :۔ میرا خیال ہے۔ وہ ہلکے گہرے رنگ کا سوٹ پہن لوں

بہو :۔ ہاں وہ تمھیں خوب پھبتا ہے

بیٹا :۔ (طنزاً) پھر تو میں بالکل انسان بن جاؤں گا نا....... پتا نہیں کیا بات ہے لیکن یہ حقیقت کہ میں حبیب سے بہت جلتا ہوں حالانکہ میرے دل میں اس کے خلاف بغض ہے نہ کینہ مجھے اپنا یہ دوست اتنا پسند ہے کہ اگر وہ چاہے تو دونوں جہان اس پر قربان کر دوں

بہو :۔ جب تمھیں وہ اتنا عزیز ہے تو تم جلتے کیوں ہو ؟

بیٹا :۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ پتا نہیں کیا بات ہے ؟ جب وہ یہاں آ ملتا ہے تو مجھے سوتے میں اور جاگتے میں ایک عجیب و غریب خواب سا نظر آتا ہے۔ جیسے وہ اور تم دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہو اور لطف یہ ہے کہ میں بالکل نہیں جلتا بلکہ تمھیں یوں خنداں دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں ـــــ لیکن یہ اس خواب کی بات ہے۔ اصل میں میں اس سے بہت جلتا ہوں کبھی کبھی یہ بھی چاہتا ہے کہ اسے قتل کر دوں اس کا گلا گھونٹ دوں

بہو :۔ تم میں یہ شیطنت کہاں سے آگئی

بیٹا :۔ پتا نہیں

بہو :۔ میرے دماغ میں بھی عجیب عجیب خیال آتے ہیں میں گھنٹوں یہ سوچتی رہتی ہوں جیسے تم

Join eBooks Telegram

مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہو

بیٹا : واقعی ؟

بہو : ہاں سچ کہتی ہوں کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے تم مجھے کھینچ کر حبیب کی طرف لے جا رہے ہو یا کبھی حبیب کو پکڑ کر میری طرف لا رہے ہو تا کہ جب تم ہم دونوں کو اکٹھا دیکھو تو شور مچاؤ جھگڑا کھڑا کر دو اور مجھے طلاق دے دو

بیٹا : میں یہ کیا سن رہا ہوں ؟ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے .... کیا تم حبیب سے محبت کرتی ہو.. یا کرتی رہی ہو ؟ .... یا محبت کرنے کی خواہش رکھتی ہو ؟

بہو : اب تک تو ان میں سے کوئی بات نہیں ہے

بیٹا : وعدہ کرو کہ جس لمحہ تم میرے سوا کسی اور سے محبت کرو گی اسی لمحہ مجھے بتا دو گی ——— میں خاصا فراخ دل واقع ہوا ہوں

جمیل : جمیل ! ہوش کی بات کرو

بیٹا : میرے ہوش و حواس قائم ہیں یاد رکھو شاہدہ میں دنیا میں ایک بات نہیں چاہتا اور وہ یہ کہ میں کسی سے دھوکہ کھاؤں ۔ ظاہر ہے کہ میں دل سے یہ نہیں چاہ سکتا کہ تم کسی اور سے محبت کرو کیونکہ میں تم سے والہانہ محبت کرتا ہوں ——— لیکن مجھے تمہارے دل پر اختیار نہیں ہے تم سے فقط اتنا چاہتا ہوں کہ اگر تمہارا دل کسی اور کی محبت محسوس کرتا ہے تو فوراً میرے منہ پر کہہ دو میں بالکل برا نہ مانوں گا ۔

بہو : اب اپنی تقریر ختم کرو اور مجھے بھی کچھ کہہ لینے دو آخر تم چاہتے کیا ہو ؟

بیٹا : مجھے خود نہیں معلوم میں کیا چاہتا ہوں .... میں چاہتا کہ اس سارے کھیل کا اگر کوئی انجام ہے تو وہ فوراً آئے جب وہ اپنے شہر میں ہوتا ہے تو میں اس سے شدید نفرت کرتا ہوں لیکن جونہی میں اسے یہاں تمہارے سامنے دیکھتا ہوں اور وہ بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا ہے ، میں بھائی کی طرح اسے چاہتا ہوں ——— مجھے یقین ہے ، میرا دل کہتا ہے کہ تم اس سے محبت کرتی ہو اگرچہ تمھیں معلوم نہیں ہے

بہو : شاید ایسا ہی ہو مگر مصیبت یہ ہے کہ تم اپنا تصور بھی میرے سر منڈھ دیتے ہو

بیٹا : جس طرح تم اپنا تصور میرے سر منڈھ دیتی ہو ۔

Join eBooks Telegram

بہو :۔ نہیں جس طرح تم!

بیٹا :۔ جس طرح تم! .... (لہجہ بدل کر) میں پاگل ہو جاؤں گا مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو

بہو :۔ ایسی باتیں تم کرتے ہو

بیٹا :۔ (لہجہ بدل کر) تمھیں مجھ پر رحم بھی نہیں آتا

بہو :۔ مجھے رحم کرنے کی کیا ضرورت ہے جبکہ تم مجھے ایسے نشتر چبھوتے ہو

بیٹا :۔ (بیحد دکھ کے ساتھ) تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی

بہو :۔ (بیحد دکھ کے ساتھ) تم نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی

بیٹا :۔ اب پھر وہی جھگڑا شروع ہو گیا ہے جو مرتے دم تک ختم نہ ہو گا۔

بہو :۔ تو اسے بر وقت ختم کر دو ـــــ تم ابھی تک نہیں نہائے ہو، جاؤ اپنے سر پہ پانی ڈالو تاکہ تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو

بیٹا :۔ یوں کہو کہ اب تم تنہائی چاہتی ہو .... اچھا جاتا ہوں (چلا جاتا ہے)

دوست :۔ (قریب آتے ہوئے) آج تو خوش نصیبی مجھ پر اچانک مہربان ہو گئی ہیں یہاں سے نکلا تو سامنے ہی ایک کمرہ ملیگا

بہو :۔ کہاں ہے وہ کمرہ

دوست :۔ وہ سڑک جس جگہ ختم ہوتی ہے، وہاں سکول کی عمارت کے عین سامنے پاپولر ہوٹل ہے ـــــ میرا خیال ہے جمیل میاں میرا ہی ذکر کر رہے تھے

بہو :۔ ہاں

دوست :۔ کیا ذکر ہو رہا تھا؟

بہو :۔ رقابت اور کیا

دوست :۔ لیکن رقابت کی کوئی وجہ بظاہر تو نظر نہیں آتی

بہو :۔ تو گویا آپ چلے جائیں گے! .... نہیں میں آپ کو نہیں جانے دوں گی، یہاں سے جانے کا آپ کا کوئی حق نہیں ہے

دوست :۔ لیکن فرض ضرور ہے

بہو :۔ اگر آپ جمیل صاحب کے سچے دوست ہیں اور اگر آپ کے دل میں میرے لئے کوئی ہمدردی

Join eBooks Telegram

ہے تو آپ یہاں سے نہ جائیے اس گھر کی ہر چیز مجھے کھانے کو دوڑتی ہے، ہر شخص یہاں کمینگی کی حد تک مجرمانہ ذہنیت رکھتا ہے ـــــ جمیل صاحب آپ کی بہت عزت کرتے ہیں، بھائیوں کی طرح آپ سے محبت کرتے ہیں آج تو آپ کی بے حد تعریفیں کر رہے تھے

دوست: ہاں یہ جلن کی شائستہ صورت ہے ـــ میری تعریفیں سنکر آپ نے کیا کہا تھا؟

بہو: آپ خود ہی بتائیے میں بھلا کیا کہہ سکتی تھی

دوست: (ذرا ہنس کر) لیجئے الٹا آپ نے مجھی پر سوال کر ڈالا!

بہو: (بے حد جذباتی ہو کر) آپ تو مجھ سے اس طرح کھیلتے ہیں جس طرح بلی چوہیا کے ساتھ آپ نے خود ہی مجھے اپنے جال میں پھنسایا، میں اس جال سے نکلنے کی پوری کوشش کر چکی ہوں ـــــ لیکن اف میں نہیں نکل سکتی، خدا کیلئے مجھ پر رحم کیجئے، آپ وہاں پتھر کے بت کی طرح بیٹھے ہوئے قربانیوں اور چڑھاوں کا انتظار کیوں کر رہے ہیں، اٹھئے اور مجھے ان روحانی اذیتوں سے نجات دلائیے ـــــ آپ طاقتور ہیں آپ کو اپنے جذبات پر قابو ہے، مگر محض اس لئے کہ آپ نے کبھی ـــــ کبھی اتنی محبت نہیں کی جتنی محبت میں آپ سے کرتی ہوں۔

دوست: (تو پھر آپ کو میری محبت کا علم ہی نہیں ہے میں اس پہلے لمحے سے آپ سے محبت کر رہا ہوں جب میں نے آپ کو پہلے پہل دیکھا تھا، کیا آپ کو تین برس پہلے کی وہ شام یاد ہے جب میں یہاں پہلی مرتبہ آیا تھا؟ جمیل باغ میں بیٹھا ہوا آپ کو اپنا تازہ افسانہ سنا رہا تھا جمیل نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا، یہ میرا واحد دوست ہے، تعارف کرانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا گیا تھا کیونکہ وہ اس دن افسانہ لکھنے کے بعد بہت تھک گیا تھا اور میں اور آپ کئی رات گئے تک گھاس پر بیٹھے گفتگو کرتے رہے تھے، آپ کو کیا معلوم اسی گفتگو کے دوران میں ہمیشہ کیلئے آپ کا ہو چکا تھا اور جب آپ نے یہ دیکھ کر کہ اوس پڑنے لگی ہے، میرے لئے اپنا شال بچھا دیا تھا تو اس پر بیٹھ کر میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے میں انہی چند لمحوں کی خوشی لینے کیلئے پیدا ہوا تھا، میں ان دنوں بہت پریشان تھا، دکھوں نے میری کمر توڑ دی آپ کی شال پر بیٹھ کر میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے میں نئی دنیا میں آگیا ہوں، پھر اگلی صبح جب میں نے جمیل کے سامنے آپ کے حسن کی تعریف کی تھی تو بہت خوش ہوا تھا، اس نے پچھلے سال بتایا تھا کہ اسے میری تعریف سنکر یوں محسوس ہوا تھا، جیسے میں نے اس کے لئے ایک نئی کائنات دریافت کر دی ہے ...... ہوتے ہوتے جمیل روحانی طور پر میرے

Join eBooks Telegram

بے سے واقف ہوگیا پھر تو اس نے مجھ پر طعن و تشنیع کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا شروع
روع میں تو مجھے اسکی باتوں پر بڑا غصہ آتا تھا لیکن میں پی جاتا تھا اب تو کبھی کبھی اتنا غصہ آتا ہے کہ
چاہتا ہے اسے دھکا دے کر ایک طرف ہٹا دوں اور اس کی جگہ خود سنبھال لوں .... کیا آپ کو وہ
ام یاد ہے جب میں نے اپنی سالگرہ کے موقع پر آپ دونوں کو اپنے کمرے میں چائے پر بلایا تھا (یہ دوسری
ت ہے کہ وہ چائے بھی آپ ہی کے باورچی نے بنائی تھی) اس شام آپ کالی ساڑھی پہن کر آئی تھیں
ر آپ نے مجھے گلاب کے پھول کا تحفہ دیا تھا تو اس لمحہ مجھے آپ اتنی حسین لگ رہی تھیں ــــــ اتنی.
ین کہ میں شکریہ ادا کرنا بھی بھول گیا میں جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا اور وہاں بہت رویا
ج تک میں اتنا نہیں رویا جتنا اس شام رویا تھا

بہو :۔ آپ کم از کم اپنے جذبات چھپا تو سکتے ہیں

دوست :۔ آپ کو یاد ہے پچھلے سال کیا ہوا تھا، سنئے اصل بات میں آپ کو بتاتا ہوں، اس شام
تینوں بیٹھے ہوئے اپنی زندگی کی بھولی بسری یادیں تازہ کر رہے تھے اور ہم دونوں کی محبت جاگ
ی تھی ــــــ یاد ہے نا؟ ــــــ تو جمیل نے کہا تھا مجھ پر افسانہ لکھنے کا موڈ سوار ہے میں جا رہا ہوں
دونوں شطرنج کھیلو، یاد ہے اس کا جواب میں نے کیا دیا تھا؟

بہو :۔ آپ نے کہا تھا "مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے"

دوست :۔ اور میں نے اسی لئے آپ کے ساتھ شطرنج نہیں کھیلی تھی اور دوسرے دن سورج نکلنے
سے پہلے میں یہاں سے چلا گیا تھا

بہو :۔ اور میں تڑپنے اور سسکنے کیلئے رہ گئی تھی

دوست :۔ ابھی میری کہانی ختم نہیں ہوئی ــــــ میری طلاق کا باعث بھی آپ ہی کی محبت ہے
ن سال پہلے آپ کا کھلونا بن جانے کے بعد میری ہر حرکت آپ کے تابع ہوگئی میں بالکل کٹھ پتلی بن گیا
..... میری بیوی ہر وقت گلے شکوے کرتی رہتی تھی، اس کی باتوں سے مجھے بڑی الجھن ہوتی تھی
جھنیں بڑھتی گئیں اور پچھلے سال جب میں یہاں سے گیا تو سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اسے طلاق
ے دی ــــــ آپ نے کبھی یہ نہ سوچا کہ میں کتنا رو رہا ہوں گا۔ اور اب میری آنکھوں میں کتنے
سو ہوں گے

Join eBooks Telegram

بہو : اب ایک آنسو بھی نکلنے نہ دوں گی

دوست : اب تو سارا قصہ ہی ختم ہو گیا ہے، اب تو صرف یہ باقی رہ گیا ہے کہ میں یہاں سے چلا جا

بہو : نہیں کبھی نہیں، اب تو میں ایک لمحہ کیلئے بھی آپ کو اپنے سے جدا نہ ہونے دوں گی کیوں

ہم چیزوں کو اسی طرح رہنے دیں جس طرح وہ ہیں آپ کو اپنے جذبات پر قابو ہے، میرا مطلب ہے کہ آپ

خاموش رہتے ہی ہیں اور میں بھی اب بالکل آپ کی طرح خاموش ہو جاؤں گی جمیل آخر ہمارا کیا کریں گے

جبکہ انہیں ہمارے جذبات کا پتا ہی نہ چلے گا ـــــ اب یہی دیکھ لیجیے ہم کتنی دیر سے یہاں بیٹھے ہوئے ؟

اتنی پرانی محبت کی باتیں کر رہے ہیں لیکن کسی کو معلوم بھی نہیں ـــــ میں کہتی ہوں کسی کو شک بھی گز

دوست : بس یہ صاف کہہ دیتا ہوں کہ اگر کچھ ہو گیا تو میں صفائی پیش کرنے کی جرأت نہ کر سکو

بہو : لیکن میں یہ جرأت کر سکتی ہوں آپ کی طرف سے بھی اور اپنی طرف سے بھی

دوست : ہاں آپ کر سکتی ہیں ـــــ آپ آگ لگانا جانتی ہیں تو بجھانا بھی جانتی ہوں گی۔

آیئے ہم دنیا میں ایمانداری کی ایک انوکھی مثال قائم کریں۔ جب جمیل آئے گا تو ہم اس سے صاف کہہ د

گے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں بتاؤ ہمیں کیا کرنا چاہیئے

بہو : خود انھوں نے بھی مجھ سے ایک دفعہ کہا تھا کہ جس لمحہ تم کسی اور سے محبت کرو اسی لمحہ مجھے

بتا دینا ...... (لہجہ بدل کر) جانے طرح دل دانع ہوئے ہیں۔

دوست : لیکن ایک بات بتا دوں پھر میں ہمیشہ کیلئے آپ سے بچھڑ جاؤں گا۔

بہو : شاید ہم ہمیشہ کیلئے مل ہی جائیں!

دوست : وہ کس طرح ؟

بہو : وہ اس طرح کہ پہلے آپ مجھے یقین دلائیں کہ آپ مجھ سے واقعی محبت کرتے ہیں تاکہ میں

کسے آگے ...اونچا کر کے کہہ سکوں

دوست : تمام دنیاؤں کی قسم میں آپ سے بے پناہ محبت کرتا ہوں آپ کی یہ بڑی بڑی زندہ آنکھیں

اور آپ کے یہ لمبے لمبے کالے کالے بال اور آپ کے گال پر چپکا ہوا یہ قیامت کا تل اور ....

بہو : ٹھہریئے وہ آ رہے ہیں!

دوست : کون ؟

Join eBooks Telegram

باپ :۔ (قریب آتے ہوئے، معاف کرنا بھئی میں ذرا یہ اخبار لینے آیا تھا .... سنا ہے آپ نے
ی کمرہ کرایہ پر لے لیا ہے

بہو :۔ یہ یہیں ٹھہریں گے

باپ :۔ جیسے آپ کی اور ان کی مرضی میں نے تو صرف پوچھا ہے (چلا جاتا ہے)

دوست :۔ اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ مجھے ان لوگوں سے بد بو آتی ہے

بہو :۔ اگر آپ کہیں تو یہاں سے بھاگ چلیں

دوست :۔ نہیں ـــــ میں اکیلا جاؤں گا

بہو :۔ میں آپ کو اب اکیلا نہیں چھوڑ سکتی، میں آپ کے ساتھ جاؤں گی، ہم اکٹھے جئیں گے اور اکٹھے مریں گے

دوست :۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے دوستی اور شرافت کو قتل کر دیا ہے .... جیسے میں جہنم
آگ ہوں اور جیسے میں نے اس ہنستی کھیلتی پھولوں بھری دنیا کو جلا کر راکھ کر دیا ہے

بیٹا :۔ (قریب آتے ہوئے ہوئے) آپ دونوں اس قدر خاموش کیوں ہیں ؟

دوست :۔ اس لئے کہ ....

بیٹا :۔ اور آپ اتنے پریشان کیوں ہیں ؟

دوست :۔ اس لئے کہ ...... ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں

بیٹا :۔ (قدرے خاموشی کے بعد) کیوں شاہدہ کیا یہ سچ ہے ؟ (خاموشی کا مختصر وقفہ) خاموشی
مطلب ہاں (بے حد دکھ کے ساتھ) تو آپ یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہیں ؟

دوست :۔ اس لئے کہ تم ایمانداری اور صاف گوئی کو پسند کرتے ہو

بیٹا :۔ تم نے بالکل صحیح بات کی، لیکن ہے یہ بڑی شرمناک !

دوست :۔ تم نے خود شاہدہ سے کہا تھا، "جب وہ لمحہ آئے کہ تم کسی اور سے محبت کرو ......"

بیٹا :۔ اور اب وہ لمحہ آن پہنچا، میں دیر سے جانتا تھا کہ یہ لمحہ آئے گا اور ضرور آئے گا ـــ لیکن
یہ آیا ہے تو یقین نہیں آرہا ...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ـــ یہ کیا ہو گیا ہے ـــ اب
ہو گا؟ کیا ہونے والا ہے، اف خدایا!

دوست :۔ تمہیں مجھ سے تو کوئی شکایت نہیں ؟

Join eBooks Telegram

بیٹا : (بالکل نہیں ۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں پچھلے سال جب یہ خطرناک لمحہ آنے والا تھا تو تم یہاں سے بھاگ گئے تھے لیکن تم دوبارہ یہاں کیوں چلے آئے

دوست : (بے حد دکھ کے ساتھ) میں تو یہ سمجھا تھا کہ میرے جذبات مر چکے ہیں

بیٹا : (ہاں تم ٹھیک کہتے ہو تم نے واقعی یہی سمجھا ہوگا ۔ بہر حال اب ہمیں ایک ایسی سنگین حقیقت کا سامنا ہے جو تم نے پیدا کی ہے نہ ہم اسے روک سکتے ہیں ہم سب نے مصنوعی ظرف ہمدردی سے اسے روکنے کی کوشش کی تھی ، آخر یہ آسمانی قہر ہم پر نازل ہو کر رہا ۔ اب سوچنا یہ ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے ! ہم تینوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ ہم میں سے کوئی دوسرے کا دشمن نہ بن جائے دوستی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے ! بتاؤ حبیب ! کیا کرنا چاہئے ؟ ____ شاہدہ تم ہی کچھ بتاؤ .... آپ دونوں خاموش ہیں ...... معلوم ہوتا ہے آپ دونوں کے پاس کوئی جواب نہیں ہے

دوست : (میرے خیال میں بہترین حل یہ ہے کہ میں دستبردار ہو جاؤں)

بیٹا : (میرا خیال بھی یہی ہے

دوست : میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا

بیٹا : (دیکھو میرے دوست حبیب ! اگر تم کسی سے سچی محبت کرتے ہو تو میں اسکی قدر کرتا ہوں ____ لیکن محبت مجھ میں بھی تو ہو سکتی ہے ____ اور آپ دونوں کو بھی تو سوچنا چاہئے کہ میں نسبتاً زیادہ بے گناہ ہوں اور اگر سب کچھ آپ کی خواہش کے مطابق ہوا تو تینوں کا دکھ مجھ اکیلے کو سہنا پڑیگا

دوست : (اف ! جمیل ، میں تم سے معافی چاہتا ہوں .... میں ابھی یہاں سے چلا جاؤں گا ہمیشہ کیلئے

بیٹا : (حبیب ! اس کا حل یہ نہیں ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ تم تین برس سے یہی کرتے آرہے ہو ____ اس سے مسئلہ اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے .... اس پل صراط پر سے میں ہی گزروں گا ، میں دستبردار ہوتا ہوں اپنے دوست کے حق میں ، اس عورت کی خاطر جس سے میں بے پناہ محبت کرتا ہوں !

دوست : اگر میں انھیں یہاں سے چرا کر لیجاتا تو مجھے اس احساس جرم سے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی تمہاری اس فراخدلانہ پیشکش سے ہو رہی ہے

بیٹا : (اور مجھے شاہدہ کو تمہیں دینے میں اتنی تکلیف نہیں ہو رہی ہے جتنی تمہارے ہاتھوں لٹنے سے ہوتی .... میں آپ دونوں کو پانچ منٹ دیتا ہوں جلد از جلد کوئی تصفیہ کر لیجئے

Join eBooks Telegram

ں اتنے میں باہر ٹہلتا ہوں (چلا جاتا ہے)

بہو :۔ بتایئے اب کیا کرنا ہے

دوست :۔ میرا خیال ہے ہم نے سخت حماقت کی ہے دراصل میں بڑا ہی بدنصیب ہوں

بہو :۔ پھر وہی بدنصیبی وہی کم نصیبی!

دوست :۔ جمیل بالکل سچائی پر ہے، ہم دونوں برائی کے راستے پر ہیں

بہو :۔ کیا یہ باتیں آپ کو اسی وقت کرنی تھیں ؟ آخر آپ کا ضمیر صاف کیوں نہیں ہے .... پ جھجکتے کیوں ہیں ؟

دوست :۔ میں جھجکتا اس لئے ہوں کہ آپ کی یہ فراخدلی جذبات کی سرکشی کے تابع ہے، ہماری ں ایمانداری سے بیوفائی کی بدبو آتی ہے ہم دونوں پتھر بن گئے ہیں آپ نے شوہر کو ٹھکرا دیا اور میں دوست کو!

بہو :۔ اف! ——— پھر آپ چاہتے کیا ہیں

دوست :۔ اپنے پہلے لیجے ہیں) اور مجھے تو اب یہاں تک محسوس ہونے لگا ہے کہ اس گھر کی ساری خرابیوں ذمہ دار آپ ہیں۔

بہو :۔ یا آپ! آپ ہی تھے وہ جس نے اپنی شرمیلی نگاہوں سے مجھے اکسایا تھا، آپ کی وہ مصنوعی ...وشی ایک فریب تھی ——— اف خدایا! ——— سخت دھوکہ ——— اور مجھے ترغیب دلانے والے ... فرشتے کا بھیس بدل لیا ہے! ....

دوست :۔ (دور جاتے ہوئے) ہاں میں فرشتہ ہوں اور بدی کی اس دنیا سے رخصت ہوتا ہوں (چلا جاتا ہے)

بیٹا :۔ (قریب آتے ہوئے) کیا ہو گیا؟ .... (وقفہ) کیا تم میں تصفیہ نہیں ہو سکا؟

بہو :۔ خاموش رہو جمیل ...... مجھے خاموش رہنے دو ——— خدا کے واسطے مجھے اکیلا رہنے دو.....

بیٹا :۔ لیکن حبیب اتنی تیزی سے کیوں بھاگا جا رہا تھا؟ میں نے ابھی ابھی اسے باغ سے نکلتے دیکھا

ماں :۔ (قریب آتے ہوئے) آج تم لوگ ناشتہ کرو گے یا نہیں؟

بیٹا :۔ بس ابھی آتے ہیں........

Join eBooks Telegram

ماں :۔ تمہارے وہ حبیب صاحب کہاں گئے کیا ہمیں اب ان کا بھی انتظار کرنا پڑے گا؟

بیٹا :۔ نہیں ان کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں وہ حضرت پھر بھاگ گئے ہیں

ماں :۔ عجیب آدمی ہے ——— میں یہ اطلاع دینے آئی ہوں کہ ——— ———

رشتہ دلہر (قریب آتے ہوئے) ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے

باپ :۔ (قریب آکر) معاف کرنا بھئی مجھے تو سخت بھوک لگی ہوئی ہے آپ لوگ نہیں آتے تو نہ سہی میں تو ناشتہ کرتا ہوں

بیٹا : اب آپ چاہیں تو اوپر والے کمرے میں سو سکتے ہیں

باپ :۔ شکریہ جناب ——— اب مجھے اسکی ضرورت بھی نہیں رہی۔

بیٹا :۔ کیوں اب مچھر بھاگ گئے ہیں کیا؟

باپ :۔ مچھر تو میرے گھر میں آ ہی نہیں سکتے!

بیٹا :۔ آپ بڑی جلدی بدل جاتے ہیں

باپ :۔ یہ بیماری تو ہم سب میں ہے

بیٹا :۔ (ہنس کر) آپکا محاورہ تو یہ ہے کہ "دنیا کا بادشاہ وہ ہے جو بیماری میں خوش رہتا ہے"

باپ :۔ ارے ہاں میں یہ محاورہ تو بھول ہی گیا تھا........ تم نے کس سے سنا؟

بیٹا :۔ شاہدہ سے

باپ :۔ کیوں بیٹی شاہدہ! تم نے یہ محاورہ کب سنا تھا ——— شاید جب تم اس گھر میں نئی نئی آئی تھیں

بیٹا : آج ان سے کوئی بات نہ پوچھو

ماں :۔ اچھا چلو چلو........ اب ناشتہ کرو خواہ مخواہ ٹھنڈا ہو رہا ہے

رشتہ دلہر :۔ اب تو بالکل ہی ٹھنڈا ہو گیا ہے

باپ :۔ ہاں بھئی جلدی کرو مجھے تو سخت بھوک لگی ہوئی ہے ...... چلو شاہدہ بیٹی اٹھو........ اے تم اتنی پریشان کیوں ہو........ غم ہے تو پی جاؤ، غصہ ہے تو تھوک دو ——— چلو اب جلدی کرو ورنہ خواہ مخواہ محاورہ سننا پڑے گا۔

(سب کے ہنستے کھیلتے چلے جانے کی آوازیں)

Join eBooks Telegram

معین انور

پرانی قمیص

چھوٹے صاحب آج کئی دنوں کے بعد اپنے کپڑوں کی الماری ٹٹول رہے تھے کہ ایک ایسی قمیص ان کے ہاتھ لگی ی تو اچھی خاصی، مگر کندھوں کے پاس ذرا سی پھٹی ہوئی تھی۔ انھیں بڑا تعجب ہوا کہ یہ قمیص اب تک انکی الماری میں ل رکھی رہی! آہستگی کے ساتھ انھوں نے قمیص بار بار گھمائی اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا پھر کچھ سوچنے کے بعد کی کی طرف منہ کر کے آواز دی ——— "نیاز" اور چند ہی لمحوں کے بعد نیاز ان کے کمرہ میں تھا

"بڑے خوش قسمت ہو ——— تو ایک اور نکل آئی" چھوٹے صاحب مسکرانے لگے اور نیاز بھی مسکرا دیا

نیاز کی منہ بولی ماں بسم اللہ بی دوپہر کے طول طویل پکوان سے ابھی ابھی فارغ ہوئی تھی اور اپنے مخصوص کمرہ فرش پر پاؤں پسارے بیٹھی ہوئی تھی، قریب ہی انکی ——— پان کی تھیلی پڑی ہوئی تھی کھڑکی سے باہر کہیں نظریں جمائے وہ تھیلی میں سے چھالیہ کے ٹکڑے ٹٹول ٹٹول کر نکالتی جا رہی تھی اور منہ میں ڈالتی جا رہی ی یکایک اسے یوں لگا جیسے چھالیہ کے ٹکڑوں کے ساتھ کافور کی گولی بھی منہ میں چلی گئی ہو

"آخ تھو" ہڑبڑا کر اس نے سارا پان فرش پر ہی اگل دیا اور غصہ میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگی و بے اختیار ہنس پڑا ——— بوکھلا کر بسم اللہ بی نے پلٹ کر دیکھا تو نیاز آئینہ کے سامنے کھڑا ہوا کئی زاویوں اپنی اس قمیص کو دیکھ رہا تھا جو اس نے شاید ابھی ابھی پہنی تھی ——— کافور کی خوشبو کا راز اس کی سمجھ میں ب آیا ——— ایک تو تازہ تازہ پان خواہ مخواہ اگل دینے کا غم۔ دوسرے نیاز کے ہر وقت کے چونچلے.... م اللہ بی جھنجھلا گئی۔ "غارت ہو خدا کرے" منہ ہی منہ میں نیاز کو کوستی ہوئی وہ دوبارہ تازہ پان بنانے لگی

"کیوں کیسی لگتی ہے" نیاز نے ہنس کر پوچھا

"جس نے دی ہے اسکو جا کے بتا" اس نے ترش روئی سے کہا اور تازہ پان منہ میں ڈال لیا اور بڑی حتیاط سے چھالیہ کے ٹکڑے ٹٹولنے لگی

Join eBooks Telegram

قمیص پر نظر بھر کے الزری نے کہا تھی تو مجھ پر لیے بیٹھی کہ اس کی ایک آستین بس ذرا سی بڑی ہے اور باقی سب خیر خیریت ہے اور قمیص نیاز نے الزری کے حوالے کر دی تاکہ وہ اسے ٹھیک ٹھاک کر دے

سہ پہر میں حسب معمول چائے لیکر جب نیاز شبانہ کے کمرہ میں پہنچا تو شبانہ اس کے بدن پر چھوٹی قمیص دیکھ کر ٹھٹھک سی گئی۔ نیاز کی طرف دیکھے بغیر اس نے بڑی سرد مہری کے ساتھ اس کے ہاتھ سے پیالی لے لی اور فرش پر نظریں گاڑ کر خاموشی سے پینے لگی ___ پی چکنے کے بعد نیاز سے نظریں ملائے بغیر شبانہ نے پیالی اس کے آگے بڑھا دی۔ ”آج آپ کچھ ناراض سی دکھائی دیتی ہیں“ نیاز نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

”کیوں؟ میں کیوں ناراض ہونے لگی“؟ شبانہ نے ایک ثانیہ کیلئے اسے دیکھا اور فوراً نظریں ہٹا لیں

”طبیعت ٹھیک نہیں ہو گی؟“ رک رک کر نیاز نے سوال کیا ___ شبانہ نے کچھ نہ کہا اور نیاز خالی پیالی تھامے کچھ دیر تک یوں ہی کھڑا رہا

”تمہاری یہ قمیص ___“ اب کی بار شبانہ نے نیاز پر بھرپور نظر ڈالی اور کہا ___ ”اس سے پہلے بھی میں نے دو چار بار کہا تھا کہ چھوٹے صاحب کے دیئے ہوئے کپڑے مت پہنا کرو ___“ نیاز ہکا بکا رہ گیا اس بات کا تو اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ شبانہ نے کہا ضرور تھا مگر اس کے خواب میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ شبانہ اتنی سی معمولی بات کو بھی یوں اہمیت دیگی اور برا مان جائے گی

”کہا تو تھا، مگر اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟“ نیاز نے منانا چاہا

”بات ناراض ہونے اور نہ ہونے کی نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ مجھے آخر اور کس طریقہ سے تمہیں سمجھانا پڑے گا کہ میں تمہارے جسم پر چھوٹے صاحب کے کپڑے کیوں نہیں دیکھنا چاہتی

شبانہ کی یہ نئی منطق اس کے پلے نہ پڑی

”مگر جب وہ اتنے پیار اور خلوص سے دیتے ہیں تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں“ اپنے بچاؤ کیلئے نیاز نے تاویل پیش کی۔

”نیاز! میں خود بتانا نہیں چاہتی، میں چاہتی ہوں کہ تم خود سمجھنے کی کوشش کرو“ شبانہ نے کہا اور فوراً ہی لکھنے کی میز پر جھک گئی نیاز چپ چاپ کمرہ سے باہر نکل آیا۔

رات کو جب وہ اپنے بستر پر لیٹا تو طرح طرح کے خیالات اسے ستا رہے تھے، اس کے بدن پر وہی قمیص تھی جو اسے مسلسل کچھ کہے دیئے جا رہی تھی۔ آخر اس میں خرابی کیا ہے، سوچنے لگا ___ جتنی بھی وہ کوشش کرتا

Join eBooks Telegram

س کا ذہن اتنا ہی اور الجھتا جا رہا تھا مگر قمیص نکال پھینکنے کو اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی

زندگی ــــ سے کسی کی دی ہوئی ایک ایسی استعمال شدہ قمیص کی صورت میں ملی تھی جو اسے پوری طرح فٹ نہیں ہو رہی تھی مگر اس کا بخیہ ادھیڑ ادھیڑ کر پیوند لگا لگا کے وہ اسے اپنے لئے قابل استعمال بنانے کی کوششوں میں جٹا ہوا تھا جتنی بھی وہ کوشش کرتا تھا یہ قمیص اتنی ہی اور الجھتی جاتی تھی، کبھی ایک آستین ڈھیلی پڑ جاتی کبھی کندھے سکڑ جاتے کبھی دامن پھیل جاتا تو کبھی گریبان کے حلقے تنگ ہو جاتے قمیص کو کسی بھی زاویئے سے دیکھا جاتا تھا تو وہ اس کے لئے ناقابل استعمال ہی ثابت ہوتی ــ اس کے باوجود قمیص اتار کے پھینک دینے کو اس کا جی نہ ہوتا تھا، یہ قمیص اسے جان و دل سے عزیز تھی اور یہ قمیص تو اسے پہلی بار اسی بنگلہ میں ملی تھی۔

نیاز کی ماں تو کبھی کی مر چکی تھی، ایک باپ رہ گیا تھا سو بھی دن بدن موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ دن بھر وہ ہانپتا کانپتا رکشا کھینچتے پھرتا اور رات کو حلق تک سیندھی چڑھا کے گھر آتا اور کسی کونے میں پڑ کے چپ چاپ سو رہتا۔ گھر میں کوئی جان جوان بیوی ہو تو نشہ بھی اثر کرتا ہے، اگر وہ کس کے سامنے اپنی مستی دکھاتا، دوسری شادی کی اسے ہمت بھی نہیں پڑتی تھی پہلی شادی ہی اس نے کن کن مرحلوں سے گزر کر کی تھی یہ اس کا دل ہی بہتر جانتا تھا، پھر بھی دوسری شادی کا خیال اسے ستاتا رہا مگر ایکبار جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ خود صرف چند دنوں کا مہمان ہے تو اس کو اپنے ذہن سے یہ خیال جھٹک دینا پڑا۔ اور اس خیال کے ساتھ ساتھ نیاز کا خیال بھی اس کے ذہن سے نکل گیا۔

نیاز دن بھر آوارہ گردی کرتا، محلے کے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ٹرین میں بغیر ٹکٹ دور دراز کے علاقوں میں نکل جاتا اور ہفتوں گھر سے غائب رہتا، کبھی کبھی پکڑا بھی جاتا اور کئی کئی دن تک ریلوے جیلوں میں بند رہتا اور جب عموماً راتوں کو ڈرتا ڈرتا دبے پاؤں گھر واپس آتا تو باپ اس سے کچھ بھی نہ پوچھتا گھر میں کھانے کو کچھ موجود ہوتا تو نیاز خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتا ورنہ باپ اپنے تکیہ کے نیچے سے چونی یا اٹھنی نکال کر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے مردہ لہجہ میں کہتا:

"لے، نکڑ کی ہوٹل میں کچھ کھا لے اور مجھے آدھا پیکٹ چار مینار لا دے۔"

اگر اس وقت نیاز بری حالت میں ہوتا اور اس کا حلیہ بھکاریوں جیسا ہو چکا ہوتا اور بدن پر

Join eBooks Telegram

"چھچھڑے اڑانے لگتے تو اس وقت باپ کی زبان سے بمشکل ایک جملہ نکلتا ——— "بسم اللہ ذرا اسکی خبر لینا، دیکھ کیا گت بنا کے آیا ہے"، اور بسم اللہ بی جو برابر والے کمرہ میں رہتی تھی اور عموماً اس وقت بنگلے سے ابھی ابھی واپس آئی ہوئی ہوتی اسکی خبر لیتی اور اچھی طرح لیتی ——— کوستی اور بڑبڑاتی ہوئی وہ اسے راتوں رات نہلاتی، اور وہ کپڑے پہنا دیتی جو کبھی اس کا باپ پہنا کرتا تھا اور جنکو اب ادھیڑ ادھیڑ کر نیاز کیلئے برابر کر دیا تھا، پھر بڑے پیار سے وہ اسے وہ کھانا کھلاتی جو وہ بنگلے سے اپنے ساتھ لاتی

اس رات کے بعد دو تین دن تک نیاز گھر ہی پر رہتا، فرمانبردار اور سعادتمند بیٹا بنکر راتوں کو اپنے باپ کے پیر دابتا اور ٹرپنٹائن آئل کی مالش کرتا۔ رکشا چلانے سے اس کے باپ کو ایک عجیب روگ لگ گیا تھا، دن بھر کی بیگار کے بعد جب وہ رات کو بستر پر لیٹتا تو اس کی پنڈلیوں کی رگیں بار بار یوں جھنجھنا اٹھتیں جیسے کوئی بجلی کا ننگا تار ان رگوں سے مس کر رہا ہو، تیرہ چودہ سال کے ایک نوعمر لڑکے کی کمزور اور بے دم انگلیاں اور ٹرپنٹائن آئل کی مالش اس کی رگوں کی اس جھنجھناہٹ کو ذرا بھی کم نہ کرتیں مگر اپنے بیٹے کی کمزور انگلیوں کا لمس لمحہ بھر کے لئے اس کے دل و دماغ کے ان تاریک گوشوں کو روشن کر دیتا جہاں پہلے کبھی اس بیٹے سے متعلق حسین اور خوشگوار خیالات اور تصورات اور آرزوئیں زندہ تھیں "کیا اس کا بھی یہی حشر ہونے والا ہے" تھوڑی دیر کے لئے وہ سوچتا مگر دوسرے ہی لمحہ اس کی پنڈلیوں کا درد اس کے احساسات پر تاریکی کی چادر ڈال دیتا ——— اور نیاز چند دنوں تک گھر ہی رہنے کے بعد پھر گھر سے نکل جاتا ——— دو تین ہفتوں کے لئے۔

نیاز کے باپ اور بسم اللہ بی کے درمیان کوئی رشتہ ناطہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک قسم کا رشتہ سا تھا پورے محلہ میں وہی ایک بیوہ عورت تھی جو باپ بیٹے کے دکھ سکھ میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی

اور جب نیاز کے باپ نے اپنی تنگ تاریک کوٹھری میں مسلسل تین دنوں تک گھٹنے توڑ دینے والی تکلیف برداشت کرنے کے بعد انتہائی خاموشی کے ساتھ دم توڑ دیا تھا تو اس وقت اس کے سرہانے وہی بسم اللہ بی تھی وہ تین راتوں تک جاگ کر اس کی تیمارداری کرتی رہی ——— مرنے سے قبل اس کی زبان سے آخری جملہ یہی نکلا تھا "بسم اللہ! اس کا بھی یہی حشر نہ ہونے دینا ———"

جس وقت وہ مرا گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی اور نیاز خود بھی غائب تھا۔ کفن دفن کا بندوبست خود بسم اللہ بی کو کرنا پڑا تھا، مرتے مرتے وہ نیاز کو ترکہ کے طور پر چھوڑ گیا تھا اور یہ ترکہ بلا شرکت غیرے

Join eBooks Telegram

بسم اللہ بی ہی کے حصے میں آیا۔ اپنی بے مقصد آوارہ گردی ترک کرکے نیاز نے رکشا چلانے کی ٹھانی مگر بسم اللہ بی کی ڈانٹ پھٹکار سن کر چپ ہو رہا، دن بھر وہ باہر گھومتا یا دوستوں سے پیسے مانگ کر وہ کوئی کتاب خرید لیتا اور قبرستانوں میں جا بیٹھتا ۔۔ رات کو گھر آتا اور کھانے کے بعد چپ چاپ سو جاتا سال بھر تک بسم اللہ بی نے اس ترکہ کو خاموشی کے ساتھ بھگتا مگر اسے بٹھا کر آخر کب تک کھلاتی، یہ بات تو ان لوگوں کو قرآن شریف کی کسی آیت کی طرح حفظ کرا دی گئی تھی کہ بچہ ہو یا بڑا اگر وہ مرد ہے تو اسے بٹھا کے نہیں کھلایا جاتا۔

اور ایک دن بسم اللہ بی اسے بھی وہیں لے آئی جہاں وہ کام کرتی تھی

بنگلہ خاصہ بڑا تھا اور اس میں رہنے والے لوگ بھی خاصے رحم دل اور پیسے والے تھے ۔ بسم اللہ بی نے سوچا کھاتے پیتے لوگ ہیں اور دلوں کے بھی اچھے ہیں، ہو سکتا ہے اس یتیم اور لاوارث چھوکرے پر رحم آجائے اور وہ اس کو پڑھا لکھا کے مہذب بنا کے کسی چھوٹے موٹے ہی سہی مگر شریف گھرانے میں شادی کرا دیں تین وقت کے کھانے کے ساتھ پانچ روپے ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور غالباً "لاوارث" کے طور پر بنگلہ کے افراد کی وہ اترن اور جھوٹن جو سارا سارا دن جاری رہتی ۔ اور ہر عید بقرعید کو ایک نیا جوڑا اور انعام و اکرام ــــــ اور کام ــــــ کتنے مزہ کا کام تھا۔

علی الصبح سب کے کمروں میں چائے پہنچانا، دیوان خانہ صاف کرنا۔ میز پر کھانا لگانا، پھر میز کی صفائی اور سہ پہر میں پھر سب کے کمروں میں چائے لیجانا ــــ اور ایسے ہی وہ تمام چھوٹے موٹے کام جو دن بھر چلتے ہی رہتے تھے۔

بنگلہ کے احاطہ میں چار کمروں پر مشتمل ایک مختصر سا الگ گھر تھا جو ملازموں کیلئے بنوالیا گیا تھا، اس کے چوتھے کمرہ میں ایک بوڑھی بیوہ باورچن رحیم النساء اپنی کم عمر لڑکی انوری کے ساتھ رہتی تھی ۔ نیاز کو اس چوتھے کمرے میں جگہ ملی اور انوری نے اپنے اس نئے ساتھی کیلئے ایک پرانا تکیہ اور چادر نکال کے دیدی

جس دن نیاز نے اس بنگلہ میں قدم رکھا تھا اس کے بدن پر وہی قمیص تھی جو اس کا مرحوم باپ پہنا کرتا تھا مگر بنگلہ میں آنے کے چند ہی دنوں کے بعد سے نئی قمیص مل گئی

سات آٹھ دن تک انوری کی ماں اور خود انوری کے لکچر اور وعظ سنتے رہنے کے بعد جب پہلی بار وہ صبح کی چائے

Join eBooks Telegram

لے کر چھوٹے صاحب کے کمرہ میں پہنچا تو چھوٹے صاحب جو ابھی تک اپنے بستر پر لیٹے ہوئے تازہ اخبار دیکھ رہے تھے اور حسب معمول نوری ہی کا انتظار کر رہے تھے اس اجنبی لڑکے کو دیکھکر فوراً اٹھ بیٹھے اور اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ بنگلہ میں ایک نئے ملازم کی آمد کی خبر وہ نوری سے سن چکے تھے مگر اب تک اس کو اپنے روبرو دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے انھوں نے بڑے اطمینان سے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا، نیا ملازم ان کو خاصا قبول صورت دکھائی دے رہا تھا، سرخی مائل گندمی رنگ، کھلی کھلی پیشانی بڑی بڑی چمکدار آنکھیں اور گھنے ابرو، چہرہ کے مختصر اور تیکھے نقوش کو دیکھکر انھوں نے سوچا کچھ پڑھا لکھا بھی لگتا ہے۔ مگر اس کی قمیص پر نظر پڑتے ہی ان کا پہلا تاثر کچھ دب سا گیا اور شرارت سے ان کی آنکھیں چمکنے لگیں، لبوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ دوڑ گئی

اس قمیص نے اس کے اچھے خاصے حلیہ کو کافی مضحکہ خیز بنا رکھا تھا، قمیص کے دونوں کندھے کافی نیچے کو لٹک رہے تھے، آستینوں اور جیبوں کے درمیان والی جگہ تو باقاعدہ ایک اچھی چادر سی لگ رہی تھی جو اگر لپیٹ لی گئی ہو، دامن گھٹنوں تک پہنچ رہا تھا، آستینوں کو اس نے چڑھا رکھا تھا ورنہ پتا نہیں اسکی کیا گت بنتی۔ مسکراتے ہوئے انھوں نے اسے قریب کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہا۔ تشریف رکھئے۔ نیاز ـــ جس نے اتنا ٹھاٹھ کاہے کو دیکھا تھا، صاحب کی طرف سے اپنے اس غیر معمولی استقبال پر کچھ بوکھلا سا گیا اور بیٹھنے کا اشارہ پانے کے باوجود کھڑا رہا

چائے کی ایک چسکی لیتے ہوئے وہ پھر سے مسکرائے اور نرمی سے کہا بیٹھ جائیے۔ میں نے آپ کے بارے میں پہلے سے سن رکھا تھا مگر ملاقات کا اب موقع ملا ـــ میرا خیال ہے ہم دونوں پہلے اپنا اپنا تعارف کرا لیں۔ پہلے میرا تعارف ـــ خاکسار کو احتشام کہتے ہیں۔ بی اے میں پڑھتا ہوں نت نئے دوست بنانے کا بیحد شوق ہے نوری میری بہت اچھی دوست تھی، اب چونکہ آپ اس کی جگہ پر آگئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم دونوں باقاعدہ دوستی کر لیں۔ اب آپ اپنا تعارف کرائیے ـــــ اور اپنی اس قمیص کا بھی ـــــ۔

نیاز کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ اتنی سی عمر میں کسی نے آج تک اس کو آپ سے مخاطب نہیں کیا تھا اسکی سمجھ ہی میں نہ آسکا کہ چھوٹے صاحب نے یہ سب سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا یا صرف مذاق کر رہے ہیں مگر قمیص کی بات پر شرم اور توہین کے احساس سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ان موقعوں پر تو بڑے بڑوں کے سامنے وہ چپ نہیں رہتا تھا، چھوٹے صاحب تو پھر بھی چھوٹے صاحب ہی تھے، بغیر کچھ سوچے سمجھے

Join eBooks Telegram

ہمت کرکے اس نے کہہ ہی دیا ـــــــــ "میرا نام نیاز ہے۔ اور آپ کا جو بھی ہو مجھے اس سے کیا ـــ انوری نے تاکید کردی ہے کہ میں آپ کو چھوٹے صاحب ہی پکاروں۔ قمیص کا تعارف مجھے نہیں آتا، یہ تو قمیص ہے اور اس کا نام بھی قمیص ہے۔ اگر اس کا کوئی اور نام بھی ہے تو آپ ہی نام سے پکاریں یہ میری بھی نہیں ہے میرے باپ نے مجھے دیدی تھی ـــــ" نیاز نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا اور چھوٹے صاحب بے اختیار ہنس پڑے اور بڑبڑانے لگے ـــ "خوب بہت خوب! اس کو کہتے ہیں تعارف" ـــــــ

چائے ختم کرکے پیالی نیاز کو دینے کے بجائے انھوں نے پلنگ کے نیچے کھسکا دی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ نیاز کے شانوں پر ہاتھ رکھکر انھوں نے بڑی نرمی سے کہا ـــ "برا مان گئے؟ میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ دوستی کی ابتدا کسی خوشگوار بات سے ہوتی ہے نا۔ مگر تم نے تو لڑائی شروع کردی ـــ واقعی یہ قمیص بہت بری لگتی ہے، آؤ اس موقع پر میں تمھیں ایک تحفہ دوں"

وہ تیزی سے اپنے کپڑوں کی الماری کی طرف بڑھے اور اس پر ہاتھ چلانے لگے۔ نیاز کو یقین آگیا کہ اب واقعی وہ سنجیدگی سے بول رہے تھے۔ آپ سے تم پر آجانا سنجیدگی ہی ہو سکتی ہے، الماری بند کرکے جب وہ واپس مڑے تو ان کے ہاتھ میں ایک شاندار اور نفیس کپڑے کی قمیص تھی قمیص انھوں نے نیاز کے آگے بڑھا دی اور کہا، "یہ اس وقت کی ہے جب میں ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ جیسے اب تک ویسی کی ویسی ہی رکھی ہے، صرف ایک دو بار پہنی تھی، اب مجھے یہ برابر نہیں آتی، تمھیں بالکل فٹ آجائے گی ـــــ لو ـــــ اب اسی کو اپنی دوستی کی ابتدا کا پہلا تحفہ سمجھ لو

نیاز سے انکار نہ بن پڑا

اور یہ قمیص تنہا نہیں آئی تھی اپنے ساتھ اس کی نئی زندگی کی بشارت بھی لے کر آئی تھی

چھوٹے صاحب کو چائے پہنچا دینے کے بعد وہ شبانہ کی چائے لیکر اس کے کمرہ میں پہنچا تو شبانہ نے بغیر کوئی بات کئے اس سے پیالی لے لی اور خاموشی کے ساتھ پینے لگی ـــــ نئے ملازم کے رکھے جانے کی خبر وہ بھی سن چکی تھی مگر نہ تو اس نے چھوٹے صاحب کی طرح اس کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور نہ ہی اس کو بیٹھنے کیلئے کہا۔ چائے پینے کے دوران میں وہ نیاز کی ان بے چین نگاہوں کو دیکھتی رہی جو کمرہ کی کسی بھی چیز پر نہیں ٹھہر رہی تھیں اور پورے کمرے کا احاطہ کئے ہوئے تھیں، پی چکنے کے بعد شبانہ نے خالی پیالی اس کے آگے بڑھا دی اور چپ چاپ نیاز کمرہ سے باہر نکل گیا، نظروں سے اوجھل ہونے تک شبانہ کی

Join eBooks Telegram

نگاہیں اس اجنبی ملازم کا تعاقب کرتی رہیں۔ "بڑی بدمزاج ہوگی یا پھر حد سے زیادہ مغرور" نیاز نے اس کی اس سرد مہری سے دل ہی دل میں اندازہ لگایا تھا مگر سہ پہر کو اسے پتہ چل گیا کہ نئی قمیص سے زیادہ شاندار تحفہ تو اس کو اس بدمزاج لڑکی نے دیا تھا

"تمہارا نام کیا ہے" چائے پی چکنے کے بعد اچانک شبانہ نے پوچھا اور نیاز کو یقین تک نہ آیا کہ یہ سوال اسی مغرور لڑکی نے پوچھا ہے یا ریڈیو میں سے نکل کر آیا ہے وہ خاموش ہی کھڑا رہا

"کیوں بھئی ہم تمہارا نام پوچھ رہے ہیں اور تم یوں الوؤں کی طرح پلکیں جھپکاتے کھڑے ہو آخر بات کیا ہے" اب جا کے کہیں نیاز کو یقین آیا کیونکہ اس بار اس نے خود اپنی آنکھوں سے شبانہ کے ہلتے ہوئے لبوں کو دیکھا تھا

"نیاز" اس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا

"نیاز کیا ہوا؟؟ پورا نام کہو"

"تو کیا آپ میرا پورا نام لے کر مجھے پکاریں گی" نیاز نے اسی رکھائی کے ساتھ کہا

شبانہ مسکرانے لگی اور بڑی نرمی سے کہا ——— "نہیں۔ پھر بھی اگر کوئی نام پوچھے تو ہمیشہ اپنا پورا نام بتانا چاہیئے ———" نیاز کو اس لے لہجہ کی مٹھاس بہت ہی اچھی لگی اور کل اس نے جو رائے قائم کی تھی اس پر اب اس کو شرمندگی سی محسوس ہونے لگی — پشیمانی کے احساس کو دباتے ہوئے اس نے پرسکون لہجہ میں جواب دیا "شیخ نیاز احمد"

"کچھ پڑھنے لکھنے کا بھی شوق ہے؟"

"تھا ——— مگر .... اب ...." نیاز رک گیا

"کیوں ——— اب کیوں نہیں ہے؟"

"پڑھائے گا کون؟ اس لئے"

"میں پڑھایا کروں گی کام کاج سے چھوٹ کر شام کو یہیں آجایا کرو مجھے بھی فرصت ہی رہتی ہے سمجھے" ۔ نیاز نے اپنا من بھر کا سر ہلا دیا۔ کمرہ سے جب وہ باہر نکلا تو خوشی سے اس کے پیر تھرک رہے تھے، دل باغ باغ ہوا جا رہا تھا اس لئے نہیں کہ پڑھنے لکھنے کا اسے شوق تھا اس لئے کہ بنگلہ کے کرداروں میں سے جس کردار کو اس نے سنکی اور مغرور سمجھ رکھا تھا اب وہی کردار اس کے دل میں اتر آیا تھا۔

Join eBooks Telegram

چھوٹے صاحب کی پُر خلوص اور مزیدار باتوں میں قربت کے احساس کے باوجود کچھ کچھ دوری بھی
مگر شبانہ کی باتوں میں دوری کے باوجود کتنی قربت تھی کتنی عجیب سی گھلاوٹ تھی!

اس قمیص کا سب سے پہلے انوری نے استقبال کیا تھا،

دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر نیاز اپنے کمرے میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ انوری جانے کہاں سے آدھمکی اور اسکو کھینچتی ہوئی باغ میں لے گئی اور اس پر سوالات کی بوچھار کر دی، قمیص کس نے دی ـــــ؟ کب دی؟ کیوں دی کیسے دی؟ ـــ الٹے سیدھے سوالات کے جواب دینے کی بجائے نیاز نے تعارف والا سارا قصہ کہہ سنایا اور انوری ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی، شرارت سے اس نے چوٹ کی۔ "اس کو پہن کر تم جہاں جہاں جاؤ گے میں سب کو بتا دوں گی یہ قمیص چھوٹے صاحب کی ہے" "یہ قمیص چھوٹے صاحب کی ہے" ـــ "چپ" نیاز نے اسے ڈانٹ دیا ـــــ "شریف لوگ ایسا واویلا نہیں مچاتے"

ابھی انوری کے ترنم خیز اور مختصر مختصر سے قہقہے تھمنے بھی نہ پائے تھے کہ نیاز نے شبانہ کا قصہ بھی سنا ڈالا اور انوری یکایک سنجیدہ ہو گئی بولی ـــ "جلدی جلدی پڑھنا لکھنا سیکھ لو۔ بعد میں مجھے بھی سکھانا ہاں"

"واہ مفت میں کوئی کیوں سکھاتا ہے۔ میں بی بی کا کام کرتا ہوں اس لئے وہ مجھے پڑھائیں گی تو میرا کیا کام کرے گی بتلا؟"

"میں ـــ میں تمھاری قمیصوں کو ٹھیک ٹھاک کر دیا کروں گی ـــ بولو منظور ـــ" نیاز نے اس کو آگے بڑھ کر اپنی گرفت میں لینا چاہا اور انوری اس کا منہ چڑاتی ہوئی ایک ہی چھلانگ میں اسکی نظروں سے اوجھل ہو گئی ـــــ جیسے جیسے دن گزرتے گئے نئی قمیص کی نئی زندگی نیاز کیلئے اَن دیکھے خوابوں کے سبزے سے آباد کرتی گئی۔ دونوں بھائی بہن کے کالج چلے جانے کے بعد نیاز اپنے کمرہ میں کتاب کھول بیٹھ جاتا اور شبانہ کے دئے ہوئے سبق کو اچھی طرح جی لگا کر یاد کرتا ـــ "ہو آر یو۔ تم کون ہو آئی ایم ـــ میں۔ میں ایک آدمی ہوں۔ نیاز کو بلند آواز سے سبق یاد کرتا ہوا دیکھ کر انوری ہنسنے لگتی اور اپنی خوشی کا چھیڑ چھاڑ کے روپ میں اظہار کرتی، "ہلے اسی کو کہتے ہیں انگریزی ہے ـــ" منہ پر انگلی رکھ کر وہ مصنوعی تعجب سے پوچھتی، تم کون؟ تمہارا باپ کون؟ نانا بانا، ایسی انگریزی سے تو جاہل رہنا اچھا"

نیاز چھوٹے صاحب کے ٹھیٹ لہجہ میں اسے ڈانٹ دیتا "شٹ اپ"

انوری اس بے ضرر لفظ کو بھی کوئی گالی سمجھ بیٹھتی اور جواباً منہ بگاڑ کر اسی لہجہ میں کہتی۔ "شٹاپ"

Join eBooks Telegram

تم۔ شٹ اپ تمہارے چھوٹے صاحب۔ بڑے آئے شٹ اپ، کٹ اپ کرنے والے"

شام کو دونوں کالج سے واپس آجاتے نیاز جلدی جلدی دونوں کو چائے پہنچا دیتا دوسرے تمام چھوٹے موٹے کاموں سے قبل از وقت ہی فارغ ہو جاتا۔ شبانہ کے والد بیرسٹر صاحب اور اسکی امی۔ بیگم صاحبہ کے کمروں میں نیاز کا کوئی کام نہ تھا۔ ان کے الگ الگ مخصوص ملازم تھے۔ چھوٹے صاجب ذرا جلد ہی نیاز کو چھٹی دیدیتے انھیں معلوم تھا کہ نیاز اب انگریزی سیکھ رہا ہے۔ ٹھیک سات بجے وہ کتاب لے کر شبانہ کے کمرے میں جا پہنچتا، شبانہ آدھے گھنٹہ تک اسے بڑے خلوص اور انہماک سے پڑھاتی۔ شاگرد سمجھدار ہو تو استاد کو بھی پڑھاتے ہوئے کچھ خوشی محسوس ہوتی ہے، پڑھائی ختم کر دینے کے بعد بھی وہ بڑی دیر تک نیاز کو ادھر ادھر کی باتیں بتاتی رہتی اس کا جی چاہتا کہ وہ رات بھر اسی کمرہ میں بیٹھا رہے۔ رات بھر شبانہ بولتی رہے

تمام وقت وہ مسحور سا ہو کر اسکی باتیں سنتا اور سمجھنے کی کوشش کرتا جو بھی بات اسکی سمجھ میں نہ آتی شبانہ اسکو طرح طرح کی دلچسپ مثالوں کے ذریعہ ذہن نشین کراتی۔

اسکی باتیں نیاز کیلئے اتنی اجنبی ہوتیں کہ نیاز نے خود اپنے ماں باپ کے منہ سے بھی یہ باتیں نہ سنی تھیں مثلاً جب شبانہ کھانے کے آداب کے بارے میں بتاتی تو نیاز کو بڑا تعجب ہوتا کہ آخر یہ باتیں اس باپ نے نہیں بتائیں نہ ہی مگر انوری کی ماں نے کیوں نہیں بتائیں جس نے پورے سات دنوں تک بنگلہ کے کام کاج اور آداب پر لکچر پلا پلا کر اس کا دماغ چاٹ لیا تھا

"باورچی خانہ میں کھایا نہ کرو۔ اپنا حصہ لے کر اپنے کمرہ میں چلے جاؤ اور انوری اور تم دونوں مل کر ایک ساتھ بیٹھ کر، ادب کے ساتھ، ہر ہر لقمہ کو چبا چبا کے اور نظریں نیچی کر کے کھایا کرو ایک بار میں نے تمھیں باورچی خانہ میں کھاتا ہوا دیکھا جس طرح تم کھا رہے تھے وہ مجھے بہت ہی برا لگا کیونکہ جاہل اور جنگلی لوگ ہی اس طرح کھاتے ہیں۔ اور کھاتے وقت چھوٹے صاحب بلا لیں یا میں، کوئی بھی اگر تمھیں بلائے تو ہرگز مت اٹھو، کھانا ختم کر کے اور منہ ہاتھ صاف کر کے ہی اٹھنا چاہئیے، سمجھے کہ نہیں

شبانہ بڑے پیار سے اسے سمجھاتی

ایک بار اس نے اسکی قمیص دیکھ کر کہا ——— "دوسروں کے دئے ہوئے کپڑے پہن لینا کچھ اچھی بات نہیں ہے، ان پڑھ اور گنوار لوگ پہن لیتے ہیں مگر تم تو پڑھنا لکھنا سیکھ رہے ہو نا ——— میں جانتی ہوں کہ تمھارے پاس اچھے کپڑے نہیں ہیں تو لیوں کرو کہ چھوٹے صاحب جو کچھ بھی تمھیں دیں اسکو پہن کر انھیں کے

Join eBooks Telegram

سامنے مت جایا کرو اس سے خود اپنی ہی عزت گر جاتی ہے ـــــــ"

قمیص کو مثال بنا کر کبھی کبھی وہ اس کو کردار کے بارے میں بھی بتاتی

"ہمیشہ یہ سوچو کہ آدمی اپنے ظاہری رنگ روپ سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ اپنے عادات واطوار اور گفتگو سے
جانا جاتا ہے، اگر کسی کے پوچھے ہوئے سوال کا تمھارے پاس ایک معقول جواب اور مہذب لہجہ ہے تو یوں
ہو کہ دراصل تمھارے پاس ایک بہت ہی شاندار قمیص ہے جو دوسروں کو نظر نہیں آتی مگر سوال کرنے
دیکھ لیتا ہے" شبانہ کی ہر بات اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتی۔

شبانہ کی طرح چھوٹے صاحب بھی نیاز کے قریب آگئے تھے، اچھی طرح کھل کر بات کرنے لگے تھے، مگر ان
باتوں میں شبانہ کی طرح کسی پرسکون اور شاداب وادی سے گزرنے والی ندی کی گنگناہٹ نہیں تھی جو
میں اتر جاتی ہے۔ ان کی باتوں میں آبشاروں کی سی گونج تھی جس میں بولنے والے کو خود اپنی ہی آواز سنائی نہ
بیٹھے بیٹھے وہ کسی بھی بات پر زوردار قہقہہ مارتے اور بڑبڑاتے "خوب، بھئی نیاز بہت خوب"
"نیاز ـــــ ایک کام کرو گے ہمارا" ان کی باتوں میں خلوص اور ہمدردی تو تھی مگر اپنائیت اور
اس نہیں تھی ـــــ "پلیز ذرا بازار تک ہو آؤ ـــــ ہم ایک خوبصورت تحفہ دیں گے" ـــــ

شبانہ اسے انگریزی پڑھانے لگی تو چھوٹے صاحب نے اسکو انگریزی گفتگو کی پریکٹکل تعلیم دینی شروع کی جو
بھی ان کو نیاز سے کہنا ہوتی وہ اس کو پہلے انگریزی میں ادا کرتے پھر بعد میں اس کا ترجمہ کرکے سمجھاتے
نیاز نے بہت جلد انگریزی گفتگو کے چھوٹے موٹے فقرے اچھی طرح یاد کر لئے لیکن جب انھیں فقروں
سے وہ چھوٹے صاحب سے کوئی بات کرنا چاہتا تو اس کو ان نا تمام فقروں میں سے ایک بھی کام کا نہ ملتا
فقروں پر چھوٹے صاحب کے ٹھیٹ کاروباری لہجہ اور ان کی مخصوص شخصیت کی چھاپ تھی جس سے
بے نیاز تھا

"میں آپ کا بہت ممنون ہوں گا اگر آپ میرا یہ کام کر دیں" انگریزی کا یہ طنزیہ جملہ چھوٹے صاحب کا مخصوص
جیسے بڑی کوششوں کے بعد بھی نیاز اپنی زبان پر نہ چڑھا سکا وہ ان سے بھلا کون سا کام کرواتا؟

بسم اللہ بی ـــــ نے نیاز کی آوارہ گردی کے بھرپور دن دیکھے تھے اور اسے یقین تک تھا کہ نیاز
بنگلہ میں آتے ہی سنبھل جائے گا، اب اس کو نیاز سے متعلق دیکھا ہوا اپنا خواب پورا ہوتا نظر آ رہا تھا
بسم اللہ بی رات کو بنگلہ سے واپس جانے سے پہلے کچھ دیر نیاز کے ساتھ گزارتی بڑے پیار سے اس

Join eBooks Telegram

کے سر پر ہاتھ پھیرتی اور دعاؤں کے ساتھ ساتھ نصیحتیں بھی کرتی جاتی ——— "بیٹا یوں ہی جی لگا کے کام کر۔ بڑے خاندان کے لوگ ہیں، تیری بگڑی بنا دیں گے"۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی بات چلتی اور وہ پھر نصیحت شروع کر دیتی ——— "اور بیٹا جتنی چادر ہو اتنے ہی پیر پھیلانا۔ بے صبری کرے گا تو آدھا بھی جائے گا اور سارا بھی جائے گا۔ اب تو تیرا باپ بھی نہیں تجھے بٹھا کر کھلائے"۔

انوری کی ماں ——— جس نے اسی بنگلہ میں اپنی سفارش سے بیسیوں چھوکروں کو کام پر لگوایا تھا اب بڑی حیران اور کچھ کچھ خوش بھی نظر آتی تھی کہ یہ کیسا چھوکرا ہے جسے نہ ایک پائی چرانے کی عادت ہے اور نہ باورچی خانہ میں سے حلوے، مربے اور دوسری چیزیں چھپا کر باہر لے جانے اور چٹ کر جانے کی عادت ہے اور نہ ہی بنگلہ کی عورتوں کی ازدواجی یا خفیہ سرگرمیوں پر نظریں جمائے رکھنے کا وہ تجسس اور اشتیاق ہے جو بنگلہ کے ملازمین کا خاصہ ہوتا ہے۔ انوری کی ماں نے جس چھوکرے کو بھی یہاں کام پر لگوایا تھا وہ کچھ دن تو بڑا ایماندار اور شریف بنکر رہتا تھا مگر اچانک ایک دن چھوٹے صاحب یا شبانہ کے کمرے میں سے کوئی قیمتی چیز لے کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ یا پھر پانچ دس روپے لیکر بازار سے سامان لانے جاتا تو پھر کبھی نہ لوٹتا تھا۔

انوری ——— جس نے اپنی اس مختصر سی عمر میں اپنی برادری کے کتنے ہی چھوکرے دیکھ رکھے تھے بڑی خاموشی کے ساتھ ان تمام چھوکروں سے نیاز کا موازنہ کرتی جاتی اور اسکو چوروں کی طرح دل میں چھپائے پھرتی۔ ان سب چھوکروں سے اس کا یہ نیاز کس قدر مختلف تھا، وہ سب تو اس کے ساتھ باقاعدہ عشق جتانے لگتے تھے، بات میں بات نکال کر اشاروں اشاروں ہی سے عورت اور مرد کے جنسی رشتوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے، نہانے کیلئے جب کبھی وہ حمام میں گھستی تو وہ تانک جھانک شروع کر دیتے، موقع ہاتھ لگتا تو اس کا جسم ٹٹولنے سے بھی نہیں چوکتے تھے، مگر نیاز ——— جو اسی کمرے میں اس کے بستر کے قریب ہی سوتا تھا مگر اس نے آج تک اس کے جسم کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کی تھی ——— کمرہ میں کبھی انوری کو کپڑے بدلتا دیکھتا تو خود اپنی نظریں بچا کر باہر نکل جاتا تھا اور کبھی سوتے میں اس کی نظریں انوری کی ننگی رانوں یا اس کی کم سن نیم برہنہ چھاتیوں پر پڑتیں تو جھٹ سے ان پر پردہ ڈال دیتا تھا اور انوری نیند کے عالم میں بھی محسوس کر لیتی تھی کہ کسی کی پاکباز اور معصوم نگاہوں نے اس کے کم سن اور بے حجاب جسم کی لاج رکھ لی ہے

سکھ کی گھڑیاں بہت تیز رفتار ہوتی ہیں، موسم سرما کے کسی مختصر سے دن کی طرح کہ پتہ تک نہ چلتا کہ کب

کب دن شروع ہوا اور کب ختم ہو گیا۔ نیاز پیچھے مڑ کر گزرے ہوئے ایام پر نظریں دوڑاتا تو اس کو یقین تک نہ آتا تھا کہ اسے بنگلہ میں آئے ہوئے اتنی مدت گزر گئی ہے۔ تین سال کا طویل عرصہ اسے تین ہفتوں کی طرح مختصر لگتا۔ لیکن ان تین سالوں میں وہ کتنا بدل گیا تھا۔ نیاز اب وہ پہلے والا نیاز نہیں تھا۔ اب اس کے لہجہ میں کچھ وقار اور اسکی آواز میں کچھ کرختگی پیدا ہو چلی تھی۔ اس کا مضبوط اور محنتی جسم گھر کی حیات بخش غذاؤں سے اور بھی بھر آیا تھا۔ باریک باریک سی مونچھیں نکل آئی تھیں جن کو اب وہ بڑے چاؤ سے تراشتا تھا

انوری اب اپنا ڈوپٹہ درست کرتی ہوئی اس کے سامنے آتی پہلے پہل تو اس سے بھی بے نیاز تھی۔ انوری کا الھڑ پن اب تیز اور چبھتے ہوئے فقروں میں بدل گیا تھا جن میں اسکی خاموش محبت کی ساری کسک اور چبھن سمٹ آئی تھی۔ اسکی شوخی اس کی عمر کی طرح جوان ہو چلی تھی

چھوٹے صاحب اپنی سرگرمیوں میں اب اسے بھی شامل کرنے لگے تھے۔ کالج کی ثقافتی انجمن کی طرف سے جب بھی کوئی پروگرام ہوتا تو چھوٹے صاحب اس کو بھی اپنے ساتھ لیجاتے۔ ان کے دوست احباب اگر کبھی فلم دیکھنے کا کوئی پروگرام بناتے تو نیاز کیلئے بھی ٹکٹ ریزرو کرائی جاتی اور سب کے ساتھ اسے بھی موٹر میں لیجایا جاتا۔ شاہ کی کچھ سہیلیاں اب نیاز کو بنگلہ کے ہی ایک فرد کی حیثیت سے جاننے لگی تھیں۔ بیرسٹر صاحب جن کے کمرے میں جانے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔ اب وہ اپنے کچھ چھوٹے موٹے کاموں میں ہاتھ بٹانے کیلئے نیاز کو بلایا کرتے تھے

بنگلہ میں آنے والے مہمانوں میں سے کچھ تو سب کے ساتھ نیاز کو بھی سلام جھاڑ دیا کرتے تھے۔ اس کی گفتگو عادات و اطوار اور حلیہ کو دیکھکر سب یہی سمجھتے کہ یہ بھی خاندان کا کوئی فرد ہوگا۔ دوستوں سے بھری محفل میں جب بھی کوئی اس کی طرف اشارہ کر کے اپنے میزبان سے پوچھتا "آپ کی تعریف" تو چھوٹے صاحب کے تعارف کرانے سے پہلے ہی وہ بڑے ادب سے اپنا تعارف کرا دیتا۔ "نیاز مند کو نیاز کہتے ہیں" اور کچھ ہی دیر کے بعد جب وہ ہاتھ میں چائے کی ٹرے لے کر دیوان خانے میں داخل ہوتا اور خود اپنے ہاتھوں سے سب کو پیالیاں تقسیم کرتا اور اپنی نیازمندی کا عملی ثبوت فراہم کر دیتا تو دوست احباب حیران رہ جاتے اور چھوٹے صاحب کے تکیہ کلام۔ "مائی گاڈ" کے باوجود وہ یقین نہیں کر پاتے کہ یہ نیاز مند واقعی اس بنگلہ کا ایک ملازم ہے

چھوٹے صاحب جو بنگلہ کے احاطہ میں واقع ملازموں کے کمروں میں بہت کم جاتے تھے اب گھنٹوں چوتھے کمرے میں بیٹھے رہتے اور ہنس ہنس کر بڑی بے تکلفی سے نیاز، انوری اور اسکی ماں سے باتیں کرتے رہتے کبھی کبھی ان کا رات کا کھانا بھی یہیں آجاتا اور کبھی کبھی صبح کی چائے بھی یہیں پہنچ جاتی۔

Join eBooks Telegram

انھوں نے اپنے کمرہ کی بہت ساری چیزیں اسی کمرے میں پہنچا دی تھیں۔ دو کرسیاں، چھوٹی سی میز، بجلی کا ایک خوبصورت سالپ جس سے نیلی نیلی روشنی پھوٹتی تھی اور ایک پرانا خوبصورت ترین شیلف، یہ سب چیزیں جو ان کے کمرے میں بے کار پڑی ہوئی تھیں، اب اس کمرہ کی زینت بڑھا رہی تھیں

ملازموں کے چار کمروں والے اس مختصر سے گھر میں اب زیادہ چہل پہل اور سرگرمی نیازی کے کمرے میں نظر آنے لگی تھی، بوڑھا مالی اور ڈرائیور کبھی کبھی تفریحاً نیاز کو چھوٹے صاحب کے نام سے پکار بیٹھتے اور نیاز اندر ہی اندر جھوم اٹھتا مگر جانے کیوں انوری کو یہ بات کچھ ناگوار سی لگتی۔ وہ اپنے اس نیاز کو ہر روپ میں دیکھنا گوارا کر لیتی مگر چھوٹے صاحب کے روپ میں شاید اسے ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہ کر پاتی چھوٹے صاحب لاکھ اچھے تھے مگر انوری ان کو وہ درجہ دینے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی جو اس نے اپنے دل میں نیاز کو دے رکھا تھا

انھیں دنوں نیاز نے کچھ عجیب سی الجھن محسوس کی۔ اسے کچھ یوں لگتا جیسے وہ اس قمیص کو زبردستی پہننے کی کوشش کر رہا ہو جو اس کو پوری طرح فٹ نہیں ہوتی تھی وہ قمیص جو اپنے ساتھ نیاز کے لئے نئی زندگی کی سوغات لے کر آئی تھی اب اپنے دامن میں چھپے ہوئے ان داغوں پر سے پردہ اٹھا رہی تھی جو اب تک نیاز کی نظروں سے اوجھل رہے ————

دونوں بھائی بہن کے لہجہ اور شخصیت کا وہ تضاد جس کو نیاز شروع ہی سے غیر شعوری طور پر محسوس کرتا آیا تھا اب آہستہ آہستہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ چھوٹے صاحب کے رویہ میں تو اس کو کوئی کھوٹ نظر نہ آتا مگر شبانہ کی باتیں اور سلوک اس کو بڑا عجیب سا اور پراسرار اور ناقابل فہم لگتا

کبھی چھوٹے صاحب کے ساتھ وہ سارا دن باہر گزارتا اور انھیں کے ساتھ شام کو واپس آتا تو حسب معمول سب سے پہلے اسے شبانہ کے کمرہ میں حاضری دینی پڑتی اور دن بھر کی رپورٹ پہنچانی پڑتی بغیر کچھ چھپائے صاف صاف وہ چھوٹے صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے دن بھر کے واقعات سنا ڈالتا تو شبانہ اس سے پوری طرح مطمئن دکھائی نہ دیتی اور کچھ اس انداز سے وہ کچھ ایسے سوالات کر جاتی کہ نیاز کی سمجھ میں نہ آتا آخر شبانہ اور کیا جاننا چاہتی ہے

کسی بھی موقع پر جب دونوں بھائی بہن ایک ساتھ باہر جاتے اور نیاز بھی ان کے ساتھ چلنا چاہتا تو

Join eBooks Telegram

شبانہ پہلے ہی سے پوچھ رکھتی ——— کیا پہن کر چل رہے ہو

چھوٹے صاحب کے دئے ہوئے کپڑے وہ اب بھی پہن لیا کرتا تھا مگر شبانہ کی پرانی ہدایت کے مطابق کپڑے پہن کر وہ ان کے دوستوں کے سامنے نہیں جاتا تھا مگر اب تو شبانہ کو اس کا کپڑے قبول کر لینا بھی ناگوار گزرنے لگا تھا اور بنگلہ میں جب کبھی وہ نیاز کو چھوٹے صاحب کی دی ہوئی قمیص پہنے دیکھتی تو اس سے نظریں تک نہ ملاتی۔ دوستوں سے بھری محفل میں جب بھی نیاز کی بات چل نکلتی اور چھوٹے صاحب بزعم خود اس حیرت انگیز طریقے سے اس ملازم کو مہذب بنا دینے پر ڈینگیں مارنے لگتے تو شبانہ چپ چاپ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوتی اور کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر کھسک جاتی۔ چھوٹے صاحب دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا جاتے اور نیاز ان دونوں کے دلوں کا حال تاڑ جاتا اور خود بھی کوئی مناسب موقع تلاش کر کے وہاں سے کھسک جاتا

دونوں بھائی بہن حتی الامکان اس کی کوشش کرتے کہ ان کی روزمرہ بات چیت میں کبھی انوری یا نیاز کی بات بیچ میں نہ آ جائے اور جب بات بیچ میں آ جاتی تو ان کے لبوں پر مہر لگ جاتی۔ بات ادھوری رہ جاتی اور دونوں طرح طرح کے حیلے بہانے کر کے جلد از جلد رخصت ہو جاتے۔ یا گفتگو کا رخ ہی موڑ لیا جاتا

قمیص الجھنا شروع ہوئی تو الجھتی ہی چلی گئی

دلوں کی بات کچھ کچھ زبان پر آنے لگی۔ دلوں میں ہلکی جھڑپیں ہونے لگیں۔ جھڑپ خواہ کسی بھی بات پر شروع ہوتی مگر اس کی تان آخر میں نیاز پر ہی ٹوٹتی۔ چھوٹے صاحب کو شبانہ کی نیاز کے ساتھ اس بیجا حمایت پر بڑی کوفت ہوتی تھی اور شبانہ کو چھوٹے صاحب کی نیاز کے ساتھ دکھاوے کی یہ ہمدردی ایک آنکھ نہ بھاتی کہ وہ اپنے دوست احباب میں تو اسے ایک سلیقہ مند اور مہذب رفیق کی حیثیت سے متعارف کراتے پھریں اور بنگلہ میں واپس آتے ہی چھوٹے صاحب پھر چھوٹے صاحب بن جائیں اور نیاز ان کے معمولی سے معمولی کام کیلئے بھی سائکل پر باہر دوڑتا پھرے

رفتہ رفتہ نیاز کا وجود دونوں کے درمیان ایک مستقل تنازعہ کی حیثیت اختیار کرتا گیا۔ جس کا نہ تو کوئی عملی حل ممکن اور نہ ہی کوئی عارضی سمجھوتہ ——— دونوں کے سینوں میں ایک خاموش قسم کا آتش فشاں پرورش پا رہا تھا جو کسی بھی وقت پھٹ پڑنے کو تیار تھا

اب تو آئے دن کا یہ ایک معمول سا ہو چلا تھا کہ بیٹھے بٹھائے جھگڑ پڑے۔ اٹھ کھڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے دوستوں سے بھری محفل کا رنگ بدل جاتا۔ منٹوں منٹوں میں دونوں کا رنگ بدل جاتا۔ تیور چڑھ جاتے سانسیں

Join eBooks Telegram

اور پیچے ہوجاتیں، سیر و تفریح کے پروگرام بنائے جاتے اور عین وقت پر محض نیاز کی وجہ سے ملتوی ہوجاتے پیر پٹکے جاتے ادھر ادھر کا غصہ اپنے اپنے کمروں کی چھوٹی موٹی چیزوں پر نکالا جاتا چائے کی خالی پیالیاں چھن چھناتی ہوئی برآمدہ میں بکھر جاتیں شیشم کے بنے ہوئے مضبوط دروازے گونج دار اور سخت آواز کے ساتھ بند کر لئے جاتے، بیرسٹر صاحب کو کسی بات کی خبر تک نہ ملتی، باورچیوں کے ذریعہ ایک آدھ بات بیگم صاحبہ کے کمرہ میں پہنچتی تو وہ بڑے سکون سے مسکرا دیتیں اور زیر لب کہتیں ــــــ ابھی تک بچپن نہیں گیا " ــــــ

انوری بڑی خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتی رہتی اور راتوں کو بستر پر کروٹیں بدلتی رہتی اسے لگتا جیسے کوئی اس سے اس کے نیاز کو چھیننے کی زبردستی کوشش کر رہا ہے، جس کو وہ اتنے عرصہ سے اپنے دل میں چوروں کی طرح چھپائے ہوئے ہے ــــــ ان جھگڑوں نے نیاز کیلئے بھی زندگی مشکل کر دی، پڑھائی میں جی لگتا تھا نہ پیٹ بھر کر کھایا جاتا اور نہ رات کو پر سکون نیند ہی نصیب ہوتی تھی۔ دونوں کے جھگڑوں سے فرار حاصل کرکے جب بھی وہ اپنے کمرہ میں پہنچتا تو یہاں انوری پہلے ہی سے اپنا ترکش لئے تیار بیٹھی ہوئی ملتی، وہ چبھتے ہوئے نقروں سے اس کا استقبال کرتی اور کچھ ایسا رویہ اختیار کر لیتی جیسے نیاز نے جان بوجھ کر اس کو نظر انداز کر رکھا ہے، ہر بار وہ طے کر لیتا کہ اب ایک لمحہ کیلئے بھی اس بنگلہ میں نہ رہے گا، جہاں ایک وجود کی خاطر تین ہستیاں آپس میں ٹکرا جانے پر تلی بیٹھی ہیں، مگر ہر بار انوری اپنا ترکش دوسری طرف پھینک کر دوڑتی ہوئی اس کا تعاقب کرتی اور اپنی بے بس نگاہوں سے اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوجاتی

قمیص کسی طے شدہ رفتار سے سکڑتی ہی جارہی تھی مگر لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اس قمیص کو اپنے جسم سے الگ نہ کر سکا ــــــ انوری بھی تو اس کو اسی قمیص میں چھپی ہوئی ملی تھی ــــــ انوری اسکی مونس اس کی غمخوار

ایک رات نیاز اپنے کمرہ میں بستر پر آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا ہوا تھا کہ اچانک کسی کے قدموں کی آہٹ سے اس کی آنکھیں کھل گئیں، کمرہ کی نیم تاریکی میں اسے ایک سایہ نظر آیا جو اس کے بستر سے کچھ فاصلہ پر آ کر رک گیا

" نیاز ــــــ اتنی جلدی سو گئے ــــــ " کسی کی سرگوشی سنائی دی اور نیاز ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آواز شبانہ کی تھی۔ " نہیں بی بی، سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیاز اٹھ بیٹھا

Join eBooks Telegram

"میرے ساتھ ذرا باغ تک چلو گے؟ کچھ باتیں کرنی ہیں۔" شبانہ نے جھک کر آہستہ سے پوچھا
نیاز جھجکتا ہوا اٹھا اور اس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اتنی رات گئے بھلا کیا بات ہو سکتی ہے۔
نیاز کا ذہن بری طرح قلابازیاں کھانے لگا ——— باغ میں ایک درخت کی اوٹ لیکر شبانہ کھڑی
ہو گئی اور نیاز کو بھرپور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ——۔ "نیاز تمھاری نیندیں کیوں اڑ گئی ہیں
پہلے ہیں کسی کام سے بھی تمھیں جگانے آتی تھی تو مجھے آدھے گھنٹے تک پکارنا پڑتا تھا۔

نیاز مسکرا دیا اور یوں اپنے کندھے جھٹک دئے جیسے اسے خود بھی اس کا سبب معلوم نہ ہو ——
کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد شبانہ نے اسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا ——
"نیاز ایک بات بتاؤ گے؟

"ہاں، بی بی ضرور پوچھئے ——" نیاز نے اپنے کان کھڑے کر لئے

"انوری کو تم بے حد چاہتے ہو؟" شبانہ کے اس غیر متوقع سوال نے اس کے جسم میں ایک برقی رو سی
دوڑا دی۔ اس لئے نہیں کہ وہ انوری کو چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ آخر اس سوال سے شبانہ کا کیا تعلق ہو سکتا تھا

"ہاں" نیاز نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"تو انوری بھی تمھیں چاہتی ہو گی ——؟"

"جی ——........" نیاز جھینپ سا گیا۔

"میرا بھی یہی خیال تھا" شبانہ نے ایک طویل سانس بھری اور کہا —— "مگر نیاز میں تمھیں اس سے
زیادہ کچھ اور بھی دیکھنا چاہتی تھی لیکن ——" شبانہ رک گئی نیاز کے چہرے سے اپنی نظریں ہٹالیں اور
خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی ——" لیکن یا تو میری یہ خواہش ابھی کمزور تھی یا پھر موقع نہ ملے ——
نیاز —— تم یقیناً اس سے زیادہ کچھ اور بھی بن سکتے تھے —— مگر —— اب وقت بہت کم ہے جتنی جلد ہو سکے
تم انوری سے شادی کر لو ——— ہمارے جھگڑوں میں تم دونوں کیوں اپنی زندگی برباد کرتے ہو"

نیاز —م بخود ہو کر اس کی باتیں سنتا رہا

"بابا اپنے کسی اہم کیس میں الجھے ہوئے ہیں ذرا انھیں فارغ ہو لینے دو میں خود تمھاری شادی کا مسئلہ
ان کے سامنے رکھوں گی اور انوری کی ماں سے بھی بات کر دوں گی ——— شبانہ چلنے کیلئے درخت کی اوٹ
سے نکل آئی اور کہا —— "بس صرف اتنی سی بات کہنی تھی جاؤ اور خدا کیلئے پوری نیند لیا کرو دیکھو تو تمھاری

Join eBooks Telegram

صحت کیسے گرتی جا رہی ہے ــــ"

شبانہ سے رخصت ہو کر نیاز اپنے کمرہ میں آیا تو اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا، خاموشی کے ساتھ وہ بستر پر لیٹ گیا اور ابھی ابھی کچھ دیر قبل کی بات چیت کا ہر ہر لفظ دل ہی دل میں دہرانے لگا

"تم اس سے زیادہ کچھ اور بھی بن سکتے تھے" آخر اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے ـــ؟ شبانہ اسے کس روپ میں دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر اسے اور کیا دینا چاہتی تھی ـــ تعلیم ـــ شعور ـــ مجلسی آداب، اور پیار و خلوص ـــ یہ سب کچھ آخر اسے شبانہ ہی نے تو دیا تھا اور اس سے زیادہ نیاز نے چاہا بھی کیا تھا؟

سوچنے کی وہ جتنی کوشش کر رہا تھا یہ سب باتیں اتنی ہی الجھتی جا رہی تھیں

"ہنھ ـــ شبانہ جو کچھ کریگی اسکے لئے اچھا ہی کریگی۔ سارے منتشر خیالات کو ذہن سے جھٹک کر نیاز نے کروٹ بدلی اور بے اختیار اسکی نگاہیں انوری کو ڈھونڈنے لگیں جو اسی کمرہ میں ایک کونے میں اپنے بستر پر سمٹی سمٹائی اپنے سینوں پر ہاتھ رکھے سو رہی تھی اس کے چہرے پر کچھ عجیب سا کرب اور اضطراب سمٹ آیا تھا جیسے وہ اس وقت کوئی برا اور خوفناک خواب دیکھ رہی ہو۔

نیاز نے پہلی بار ایک اور ہی زاویہ سے انوری کو بھرپور نگاہوں سے دیکھا اور اس کا انگ انگ کسی ان جانے جذبہ سے جھوم اٹھا

چند ہی دنوں میں شبانہ نے نیاز کی شادی کی خوشخبری پہنچا دی انوری کی ماں تو بہت پہلے ہی سے یہ رشتہ طے کئے بیٹھی تھی۔ بیرسٹر صاحب نے نہ صرف اجازت دیدی تھی بلکہ شادی کے مکمل اخراجات کے لئے ایک چیک لکھکر شبانہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بسم اللہ بی اور انوری کی ماں نے تیاریاں شروع کر دیں، شادی کی تاریخ دو ہفتوں کے بعد مقرر ہوئی چھوٹے صاحب نے ان دو ہفتوں کیلئے نیاز کو سونے کیلئے بنگلہ کے اندر ہی ایک الگ کمرہ دے دیا اور نیاز کو سمجھایا کہ ہونے والی دلھن کے کمرے میں اس کا سونا مناسب نہیں نیاز کا جی تو نہیں مانا لیکن بات ٹھیک ہی تھی ان دو ہفتوں میں وہ انوری کی صورت دیکھنے کو ترس گیا دو ہفتے دو سال کی طرح گزرے اور شادی کا دن آ پہنچا

شادی خاصے دھوم دھام سے ہوئی بیرسٹر صاحب اور بیگم صاحبہ جو بنگلہ کی اندرونی سرگرمیوں میں بہت کم حصہ لیتے تھے، رسم نکاح خوانی کے موقع پر بہ نفس نفیس تشریف لائے اور دولھا سے ہاتھ ملایا

چھوٹے صاحب اور شبانہ دونوں نے اپنے پرانے اختلافات کو وقتی طور پر بھلا کر خوشی کی

Join eBooks Telegram

اس تقریب میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ——— نیاز کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا پہلی بار اس نے اپنے جسم سے پرانی قمیص نکال پھینکی تھی اور ذہن سے پرانی زندگی کی تمام پرانی یادوں کو جھٹک دیا تھا اب شاندار کپڑے کی نیلگوں نئی شیروانی اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے، ڈھیر سارے پھولوں کے ہاروں سے لدا پھندا مسلسل مسکرائے جا رہا تھا، مختصر سے عرصہ کیلئے ان تمام لوگوں کو بھول کر جو اس وقت اس کو گھیرے ہوئے بیٹھے تھے وہ اپنی اس دلہن کا تصور کر رہا تھا جو اس وقت اپنے کمرے میں عورتوں کے گھیرے میں گھونگھٹ کاڑھے ہوئے بیٹھی ہوگی اور بالکل اس کی طرح اس وقت وہ اپنے دولہے کا تصور کر رہی ہوگی

نکاح اور دعوت کے جھگڑوں سے فارغ ہوتے ہوتے ہی رات کے دس بج گئے جس کے بعد بھی بڑی دیر تک، چائے اور خوش گپیوں کے دور چلتے رہے۔ گیارہ بارہ بجے کے قریب جب دیوان خانہ مہمانوں سے خالی ہوا اور چھوٹے صاحب، شبانہ بسم اللہ بی، انوری کی ماں اسے تنہائی میں چھوڑ کر دوسرے کمروں میں چلے گئے تو وہ مسکراتا ہوا دلہن کے کمرے کی طرف چلا۔ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے نیاز نے تمام پھولوں کے ہار نکال پھینکے، صرف گلاب کی ایک تازہ کلی ساتھ رکھ لی تاکہ بات چیت کے دوران موقع پا کر اس کے بالوں میں لگا دے ——— کتنی مدت کے بعد آج اسے یہ رومانٹک موقع ملا تھا

کمرہ میں داخل ہوتے ہی اس کی نظریں سب سے پہلے دلہن پر پڑیں جو ریشمی زرتار ساڑھی میں لپٹی ہوئی پلنگ کے ایک کونے میں سر جھکائے بالکل کپڑوں کی ایک گٹھری سی بن رہی تھی ——— زندگی میں پہلی بار اس نے اپنے آپ کو ایک بند کمرہ میں اس شوخ و الھڑ لڑکی کے ساتھ تنہا پایا تو اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ ہائے شادی سے پہلے اسے اظہار عشق کا موقع بھی تو نہ ملا تھا اب وہ اس مصنوعی اجنبیت کو کس طرح توڑے گا جو ان موقعوں پر ہمیشہ زبردستی ٹپک پڑتی ہے۔ دل میں تو لڈو پھوٹتے ہیں مگر زبان تک نہیں ہلتی

جلدی جلدی اس نے شیروانی اتاری اور ہلکا پھلکا ہو کر کچھ آڑی ترچھی سانسیں لیں تاکہ دھڑکن کچھ کم ہو مگر لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی مسرت کے ساتھ ساتھ دھڑکن بھی بڑھتی ہی جا رہی تھی ——— نیاز کو معلوم تھا کہ لوگ ان موقعوں پر بڑی ایکٹنگ سے دلہن کا گھونگٹ الٹتے ہیں، مگر نیاز کو یہ سب کچھ فضول سا لگا انوری نہ تو اس کے لئے اجنبی تھی اور نہ اس کی چاہت ان تکلفات کی محتاج تھی اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا ایک الگ طریقہ نیاز کو سجھائی دیا ——— اس نے کمرہ میں ادھر سے ادھر ٹکریں لگانا شروع کر دیں اور گنگنانے لگا ——— لفٹ رائٹ لفٹ رائٹ ——— لفٹ — لفٹ — اباؤٹ ٹرن گھونگٹ اٹھاؤ

Join eBooks Telegram

ساتھ ہی ساتھ دروازہ کی درازیں سے جھانک کر دیکھا بھی گیا کہ کہیں کوئی اس کے پاگل پن پر ہنس تو نہیں رہا ـــــ مگر یہ عجیب دلھن تھی نہ اپنی جگہ سے ہل رہی تھی اور نہ سر اٹھا کے دیکھتی تھی، گھونگٹ ہیں سے تو کچھ نظر نہ آتا تھا، مگر نیاز نے سوچا کہ یہ بیوقوف لڑکی مارے شرم کے پلکیں تک بھی نہ جھپکا رہی ہو گی کچھ دیر تک وہ یوں ہی اناپ شناپ بکتا رہا یکایک اسے خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ ان موقعوں پر واقعی کچھ سنجیدہ بن جانا پڑتا ہوگا، شبانہ نے اسے تو ہر بات بتائی تھی مگر شادی کی رات کو دلھن سے کس طرح بات کی جائے اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا، دل ہی دل میں وہ شبانہ کو اور اس الو کی پٹھی کو کوستا ہوا جو پہلے پہلے تو بات بے بات اس کا دماغ چاٹا کرتی تھی اور اب بڑے ٹھاٹ سے دلھن بنی بیٹھی ہے اور سر اٹھا کر دیکھتی تک نہیں ـــــ وہ پلنگ کے ایک کونے پر بیٹھ گیا اور دماغ لڑانے لگا کہ آخر وہ سنجیدہ سی بات کیا ہو سکتی ہے ـــــ کچھ دیر تک سوچ کر اس نے گلہ صاف کرتے ہوئے کہا ـــ "سن ـــ جب سے تو غائب ہوئی ہے تیرا حال تو مجھے نہیں معلوم کیا ہوا مگر میرا حال سن لے اچھی خاصی حجامت ہو گئی اگر پہلے ہی معلوم ہوتا کہ شادی کیلئے اتنے جھگڑے کرنے پڑتے ہیں تو میں بغیر شادی کے تجھ سے شادی کر لیتا" ـــــ نیاز پرانی قمیص کی پرانی زندگی کے سارے تاثرات سنا دینا چاہتا تھا مگر دلھن بدستور سر جھکائے بیٹھی رہی نہ ہلی نہ ہوں ہاں کی اور نہ ہی گھونگٹ ہٹایا ـــ نیاز کو کچھ غصہ آ گیا اس نے زور سے دلھن کے گھٹنوں کو دھکا دے کر پوچھا ـــ "منہ میں گھنگنیاں کیوں لئے بیٹھی ہے آنکھیں ملاتے شرم لگتی ہے تو کم از کم بات ہی کر"

مگر اب بھی جواب ندارد ـــــ نیاز سے رہا نہ گیا کچھ اس بے ڈھنگے پن سے اس نے انوری کا گھونگٹ الٹ دیا کہ بیچاری پیچھے کی طرف گرتے گرتے بچی ـــــ اب بڑی آہستگی کے ساتھ انوری نے اپنا سر اٹھایا اور نیاز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں، انوری کی آنکھوں میں دو چھوٹے چھوٹے چمکدار تارے لرز رہے تھے ـــــ نیاز سٹ پٹا گیا اگر اسے معلوم ہوتا کہ دلھن اتنے سیریس موڈ میں ہے تو وہ گھنٹہ بھر یوں اس کو پریشان نہ کرتا، نیاز اچھی طرح پلنگ پر جم کر بیٹھ گیا وہ انوری کے خوشی کے آنسوؤں کی بھی تاب نہ لا سکا ـــــ اور انوری کو اپنی طرف کھینچ کر اس کی آنسو بھری آنکھوں کو چوم لینا چاہا لیکن، انوری مچھلی کی طرح تڑپی اور اس کے بازوؤں سے نکل گئی اور گھٹنوں میں منہ دے کر سسکیاں بھرنے لگی ـــــ نیاز اب کچھ سنجیدہ ہو رہا تھا۔ پیار بھرے لہجے میں اس نے آہستہ سے پوچھا

Join eBooks Telegram

"انوری! شادی کی رات والے جتنے قصے بھی میں نے سن رکھے تھے وہ تو کچھ اور ہی تھے۔ مجھے اب تک نہیں معلوم تھا کہ پہلی رات کو یوں سچ مچ رونا بھی پڑتا ہے۔ لڑکیوں کے لئے تو رونا بڑی آسان بات ہوگی، مگر تیری قسم ہے مجھے اب بالکل رونا نہیں آرہا ہے۔ پہلے دو دو باتیں کرلیں پھر بعد میں جی بھر کے رو لے تب میں بھی رونے میں تیرا ساتھ دوں گا۔ مگر پہلے کچھ بات تو کر ــــ"

انوری کی سسکیاں تھم گئیں ہاتھوں سے اس نے اپنے آنسو پونچھ لئے اور سر اٹھا کر پیار سے نیاز کو دیکھا اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا، "تمہیں یاد ہے" انوری کو جیسے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

"ہاں ــ ہاں شاباش ــ بول" نیاز نے اسے ہمت دلائی

"تمہیں وہ قمیص یاد ہے نا جو چھوٹے صاحب نے تمہیں پہلی بار دی تھی؟"

"ہاں یاد تو ہے ــ ہے مگر" ــ نیاز نے بے صبری کے ساتھ پوچھا

"تو ــ تو اب مجھے بھی ان کی دی ہوئی ایک پرانی قمیص ہی سمجھ لو۔ انوری نے چہرا اپنا سر گھٹنوں میں لے لیا اور بچوں کی طرح بلکنے لگی

بنگلے کے اندر کے کمرے میں گزاری ہوئی پندرہ راتیں ایک لامختتم تاریکی میں تبدیل ہو کر نیاز کے وجود پر محیط ہوگئیں۔

تہذیب تحریر

مجتبیٰ حسین کے فکر انگیز مضامین کا مجموعہ

• سہ رنگا حسین و دل آویز سرورق • بہترین کتابت و طباعت • سفید چکنا کاغذ صفحات ۲۱۲

قیمت در ــ پانچ روپے اپنے شہر کے ہر بک اسٹال اور نیوز ایجنٹ سے طلب کیجئے یا براہ راست لکھئے

مکتبۂ افکار ــ رابسن روڈ کراچی

Join eBooks Telegram

انور عنایت اللہ

معمولی لڑکی

ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں اور آسمان کو بھورے بھورے بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں اور کشتی اب تیزی سے شہر کی طرف بہہ رہی تھی۔ ہم چند لمحے خاموش بیٹھے مضطرب سمندر کی بپھرتی ہوئی موجوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ گہرے بادل اب نیچے اترنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور سمندر کا سبز رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ بوندا باندی یکایک تیز ہو گئی۔ حامد، عارف اور اعظم کے پاس برساتیاں تھیں، صرف عجلت میں ثروت اپنی برساتی بھول آئی تھی۔ سمندر کے تھپیڑوں اور بارش کے موٹے موٹے قطروں سے بے نیاز وہ بیٹھی چپ چاپ رہی تھی۔ اس کے گھونگھریالے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے لیکن اسے اس کی پروا نہیں تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اس دبلی پتلی نازک اندام لڑکی کے جسم میں اس بلا کی قوت مقابلہ کہاں سے آ گئی تھی۔ سمندر کی مضطرب لہریں بے قابو ہوئی جا رہی تھیں۔ کشتی کا ملاح خدا بخش بکرانی ایک طرف بیٹھا اعظم کے دیئے ہوئے سگریٹ پھونک رہا تھا اور کشتی اب صرف ثروت چلا رہی تھی۔ دن بھر کی اچھل کود نے ہم سب کو تھکا دیا تھا۔ دن بھر موسم بے حد حسین رہا تھا، لیکن شام ہوتے ہوتے بادلوں نے آن گھیرا اور ایک پارٹی کار کے ذریعہ شہر کی طرف روانہ ہوئی اور دوسری سمندری راستے سے۔

بارش تیز ہو گئی تو میں نے چپکے سے اپنی برساتی اتاری اور ثروت کی طرف پھینکی جو عین اس کے منہ پر جا کر گری

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" اس نے مجھے ڈانٹا

"بھیگ رہی ہو، نمونیہ ہو جائے گا" میں نے اسے سمجھایا۔ "نمونیہ؟ ———— اور مجھے

Join eBooks Telegram

اس نے گردن اٹھا کر بالوں کو ایک جھٹکا دے کر قہقہہ لگایا "اجی حضرت مجھے کبھی نزلہ تک نہیں ہوا اگر نمونیہ ہو بھی جائے تو میں بے حد سخت جان ہوں، اطمینان رکھو مرونگی نہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے چپو ملاح کے حوالے کر دیے اور برساتی پہننے کیلئے ایکدم کشتی میں کھڑی ہو گئی اس کی اس حرکت سے ساری کشتی ایک طرف کو جھک گئی

"رنی! کے لئے بیٹھ جاؤ لولو تم سب کو لے ڈوبو گی" عارفہ نے جھری جھری سی لے کر اسے ڈانٹا وہ اپنی سہیلی کو نہ جانے کیوں لولو پکارا کرتی "اوہ بھئی تم لوگوں میں ایڈونچر کی اسپرٹ تو ہے ہی نہیں موت کا اتنا ڈر تو زندگی کو بھس بنا دیتا ہے ـــــــ کیوں ادیب صاحب؟" اس نے برساتی کی دوسری آستین میں ہاتھ ڈالتے ہوئے جھک کر مجھ سے پوچھا وہ مجھے ستانے کی خاطر ہمیشہ میرے نام کی بجائے ادیب صاحب کہہ کر پکارا کرتی، میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بس خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا، میری برساتی اس کے لئے بہت بڑی تھی۔ برساتی میں ہوا گھس گئی تھی اور وہ پھول گئی تھی اس ڈھیلی ڈھالی برساتی میں جو اس کے ٹخنوں تک لمبی تھی وہ بے حد مضحکہ خیز لگ رہی تھی وہ اس وقت برساتی کے جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی اور اس کے جسم میں ہلکا سا خم پیدا ہو گیا تھا، برساتی کا کالر اس نے اوپر اٹھا لیا تھا میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہونٹوں کے بھرے بھرے کونے اوپر اٹھ گئے، ہلکی سی مسکراہٹ چھا گئی اور بڑی بڑی آنکھوں میں خمار سا چھا گیا، یوں لگا جیسے وہ ہم سب سے دور چلی گئی ہو۔

کہاں چلی جایا کرتی ہے یہ اکثر میں نے سوچا کاش میں اس پراسرار لڑکی کے دل میں جھانک کر دیکھ سکتا، وہ بظاہر برف کا تودہ معلوم ہوتی لیکن آج نہ کیوں کئی دنوں سے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اس حسین جسم میں کہیں بے شمار چنگاریاں دبی بیٹھی ہوں اور اب وہ باہر نکلنے کیلئے بیتاب ہوں ـــ یکایک وہ میری طرف مڑی اور اس نے آہستہ سے کہا

"کس قدر حسین ہے یہ ماحول ـــــ خودکشی کو جی چاہ رہا ہے!" ـــــ "پاگل نہ بنو" ـــــ بیٹھ جاؤ" میں نے اسے ڈانٹا، ہم نے ایک دوسرے سے بے تکلفی برت کر صبح سے حامد اور اعظم کو خوب جلایا تھا۔ دونوں اس وقت کباب بنے، منہ پھلائے خاموش بیٹھے تھے، شاید اب انھیں احساس ہو گیا تھا کہ وحشی ہرنی اب چوکنی ہو گئی تھی اور اب وہ ان کے جال سے بہت دور جا چکی تھی۔

Join eBooks Telegram

"ڈرانو نہیں، اس طرح کے سوڈ کبھی کبھار ہی مجھ پر طاری ہوتے ہیں۔ آج سے پہلے صرف ایک بار خودکشی کو جی چاہا تھا" یہ کہتے ہوئے ثروت نے اپنی عزیزہ اندرانہ سہیلی کی طرف دیکھا، عارفہ نے بھی آنکھوں آنکھوں میں کچھ کہا جس کا مطلب میں سمجھ نہ سکا۔ ثروت چند لمحے خاموش عارفہ کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی یوں۔ جیسے عارفہ کی موجودگی نے اس رومانی حسین ماحول نے اسے بے شمار بھولی بسری باتیں یاد دلا دی ہوں معاً اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا وہ کھوئی کھوئی سی لگ رہی تھی اسکی اداس آنکھوں نے مجھے وہ شام یاد دلا دی جب میں نے سسکیوں کی پراسرار آواز سنی تھی، کیا وہ وہی شام تھی جب ثروت کا عزیز دوست اسے چھوڑ گیا تھا اور اس کا خودکشی کو جی چاہا تھا؟ ـــــ کیا واقعی وہ ثروت تھی جسے میں نے اس شام "کے والیٹی" میں دیکھا تھا

ـــــ میں دوسری منزل پر اپنے محبوب کیبن میں تنہا بیٹھا چائے کا منتظر تھا کہ یکایک مجھے ساتھ کے کیبن سے سسکیوں کی دبی دبی سی آواز سنائی دی، آواز نسوانی تھی دونوں کیبنوں کے درمیان لکڑی کی پتلی سی دیوار تھی، سسکیوں کی آواز نے مجھے بے چین کر دیا، نہ جانے کون تھا، باتوں کی آواز نہیں آ رہی تھی اس لئے یہ کہنا مشکل تھا کیبن میں کتنے لوگ تھے۔ لڑکی اب ہولے ہولے رو رہی تھی اس کی آواز میں بلا کا عجز تھا بیکسی تھی۔ اس کا یہ ساتھی کیسا عجیب تھا جو یوں بت بنا بیٹھا تھا، آخر یہ سنگدلی کیوں؟ بے حسی کیوں مجھے یقین تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے میں نے ایک مرد کی آواز سنی تھی، چائے کی پیالی سامنے رکھے میں خاموش بیٹھا سسکیوں کی آواز سنتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد آواز رک گئی اور کیبن پر پراسرار خاموشی چھا گئی ایک عجیب سکوت ایک عجیب اداسی

جب تھوڑی دیر کے بعد میں کیبن سے باہر نکلا تو مجھے صرف ایک حسین سڈول گورا ہاتھ نظر آیا جس میں ایک کالی نفیس چوڑیاں تھیں اور جو بے جان میز کے ایک سرے پر پڑا ہوا تھا اسکی کلائی سے ایک حسین تکونا مخملی سیاہ پرس لٹک رہا تھا جس پر سنہری کام تھا میں اس سے زیادہ نہ دیکھ سکا نہ مجھے لڑکی کی شکل نظر آئی اور نہ اس کے ساتھی کی جھلک

ان سسکیوں نے اس حسین ہاتھ نے۔ میری شام ستیاناس کر دی، بات بظاہر معمولی تھی لیکن میری طبیعت نے اس کا نہ جانے کیوں اتنا شدید اثر قبول کیا تھا، میں اس شام کے بعد کئی دنوں تک ہر شام کو "کے والیٹی" جاتا رہا، لیکن مجھے نہ وہ گورا ہاتھ ہی نظر آیا اور نہ وہ سیاہ تکونا پرس۔

Join eBooks Telegram

اس واقعہ کے کوئی دو ماہ بعد میرے دوست خواجہ اعظم نے مجھے اپنی ایک فلمی کہانی کے لئے مکالمے اور گیت لکھنے کی دعوت دی۔ اعظم کی بھی ایک عجیب شخصیت تھی گورا چٹا رنگ، طویل قد و قامت، بے حد زندہ دل خوش پوش اور خوش شکل انسان تھا، ہر وقت آنکھوں پر دھوپ کی عینک چڑھی رہتی، حد سے زیادہ فلرٹ، اسی لئے وہ دوستوں کے حلقے میں باز کے نام سے مشہور تھا، جہاں کوئی حسین لڑکی نظر آتی بس ملاقات کی سبیل ڈھونڈنے لگتا، چاپلوسی کی باتیں ہوتیں، جھوٹی تعریفیں ہوتیں اور آخر انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑنے کی کوشش ہوتی اس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ احمق سادہ لوح لڑکیاں اس مشاق بازیگر کے سامنے فوراً چھپل پڑتیں آجکل وہ ایک پرانی انگریزی کہانی کا چربہ اتار کر اسے اپنے نام سے فلمانے کی دھن میں تھا

میں حسب وعدہ پانچ بجے اس کے دفتر پہنچا وہ بیٹھا ٹیلیفون پر اپنی نام نہاد فنی عظمت کا رعب کسی سیٹھ پر ڈال کر فلم کے لئے سرمایہ اینٹھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے مقابل کرسی پر ایک لڑکی بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی، میں بیٹھ گیا تو لڑکی نے رسالہ چہرے پر سے ہٹایا ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور اب کے میز پر کہنیاں ٹیکے رسالے میں دوبارہ کھو گئی، چھوٹا سا قد تھا، دبلا پتلا جسم، گورا رنگ، کھوئی کھوئی سی آنکھیں چہرہ میک اپ کی آلائشوں سے پاک تھا جس کی وجہ سے اس پر ایک عجیب معصومیت تھی آدھی مانگ تھی اور دو چھوٹی چھوٹی مگر گھنی چوٹیاں، گھونگریالے بالوں کی ایک باغی لٹ پیشانی پر آ گئی تھی وہ ہلکے فیروزی رنگ کی قمیص اور سفید شلوار میں تھی گلے میں شیفون کا دوپٹہ تھا۔

"یار معاف کرنا گفتگو ذرا طویل ہو گئی، پہلے یہ بتاؤ کیا پیو گے؟ ——— چائے یا کافی؟" اعظم نے ریسیور رکھتے ہوئے میری طرف ذرا جھک کر پوچھا ——— "چائے" میں نے جواب دیا ——— "اور تم" اس نے لڑکی سے پوچھا "آپ کو پتا ہے میں چائے نہیں پیتی" لڑکی نے رسالے پر سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ آواز بے حد حسین تھی جس میں رس تھا اور ایک عجیب خمار جیسے ابھی ابھی سو کر اٹھی ہو یا ہلکا سا نزلہ ہو

"کوئی ٹھنڈی چیز منگواؤں؟ ——— دشعو یا آرینج؟" اعظم نے قدرے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا

"جی، صرف پانی منگوا دیجئے ——— صراحی کا" اسی جذبات سے عاری لہجے میں جواب ملا۔ اب اس نے بایاں گھٹنا اٹھا کر میز سے لگا دیا اور دائیں ہاتھ سے اس باغی لٹ کو درست کرنے لگی جو پیشانی پر لہرا رہی تھی

"اچھا بھئی ——— صرف پانی ہی سہی" خواجہ اعظم نے ٹھنڈی سانس لے کر دہرایا، گھنٹی بجا کر

Join eBooks Telegram

ملازم کو ہدایات دے اور میری طرف مڑا

بھیّا معاف کرنا میں نے تعارف نہیں کرایا یہ ہیں میری دوست ثروت ـــــ نام تو ان کا ذرا طویل ہے لیکن میں انھیں صرف ثروت کہتا ہوں اور کبھی کبھی لولو" اس نے حسب عادت خود آ بے تکلفی کا اظہار کیا اس کی آواز سن کر ثروت نے سر اٹھایا بے دلی سے اعظم کو یوں دیکھا جیسے اس اظہار بے تکلفی سے نہ اسے خوشی ہوئی ہو اور نہ خفگی، زندگی سے، اپنے گرد وپیش کے ماحول سے اور اپنے آپ سے کچھ عجیب بے تعلقی کا اظہار تھا یہ، اس چھوٹی سی عمر میں اس کی یہ بے اعتنائی کچھ عجیب سی لگی۔

"ثروت! یہ میرے عزیز دوست ہیں، نام ان کے آپ سے پہلے بتا ہی چکا ہوں، اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ بہترین ڈرامہ نگار ہیں، ادھر گیت لکھتے ہیں۔ موسیقی سے بے پناہ عشق ہے، اسی لئے ان کے گیتوں میں اتنی جادو ناہوتی ہے اپنی EXPRESSION اب یہ ہماری فلم کے لئے گیت اور مکالمے لکھیں گے۔"

اس نے میری تعریف کے پل باندھ دیئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ میرے معاوضے کی رقم گھٹانے کی بڑی چابکدستی سے ابتدائی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ اعظم کے ذریعہ اکثر لوگوں کو آمدنی کے ذریعے ملتے لیکن ہمیشہ وہ کسی کو بتلائے بغیر اپنی تگڑی کمیشن ضرور وصول کر لیتا

تعارف کے بعد اعظم نے اپنی کہانی کا پلاٹ سنایا۔ اس دوران میں کہانی کے ہر موڑ پر وہ اپنے اس فلمی شہ پارے کی خود ہی تعریفیں کرتا جاتا اور ثروت پر رعب ڈالتا جاتا وہ مستقل بولے گیا، میں خاموش بیٹھا چائے پیتا رہا اور ثروت اس کی باتوں سے بور ہو کر ہوں ہاں کرتی رہی، جب چھ بج گئے اور کام کی کوئی بات نہ ہو سکی تو میں نے اکتا کر رخصت چاہی

"ساڑھے چھ تک ٹھہر جاؤ تو میں ڈراپ کر دوں گا۔ نئی گاڑی خریدی ہے ـــــ ذرا سیر کرتے ہوئے چلیں گے" اس نے ایک بار پھر اپنی امارت کا رعب ڈالنے کی کوشش کی میں نے نرمی سے انکار کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا ـــــــــــ

"چلیئے میں ڈراپ کر دوں گی۔" ثروت نے یکایک اٹھتے ہوئے مجھ سے کہا

"تم نے کار خرید لی ہے ثروت؟ مجھے بتایا نہیں؟" اعظم نے پوچھا

"جی نہیں ایک سہیلی کی ہے، اچھا اعظم صاحب، ـــــ اب ہم چلے، میرا خیال ہے کل ملاقات ہو گی خدا حافظ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے جماہی لی دوپٹہ ٹھیک کیا اور جھک کر اعظم صاحب کی میز کے دائیں طرف

Join eBooks Telegram

والنے ریک سے اپنا پرس اٹھایا تو یکایک میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا بالکل وہی پرس تھا۔ سیاہ تکونا پرس جس پر سنہری کام تھا اب وہ پرس ہاتھ میں لئے میری طرف منہ کئے کھڑی تھی، اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اعظم کو ثروت کا میرے ساتھ جانا کچھ ناگوار لگا۔ بالآخر وہ اپنی گول گھومنے والی کرسی پر بیٹھا، ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لئے مجھے گھور رہا تھا

دوسرے دن میں دفتر میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ اعظم آ گیا اس کا یوں بے مقصد آنا ذرا حیرت انگیز تھا، وہ بغیر مطلب کے کسی سے ملتا نہ تھا ہمیشہ اسی سے دوستی بڑھاتا جس کے ذریعہ اسے مالی یا کسی اور قسم کے فائدے کی امید ہو، اس اصول سے حسین لڑکیاں مستثنیٰ تھیں۔

وہ کمرہ میں آتے ہی بڑی بے تکلفی سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور باتیں شروع کر دیں، حسین جوان لڑکیوں کی باتیں، جوان جسموں کی باتیں، شہر کے تازہ اسکینڈلز کی باتیں، اپنی عظمت اور ذہانت کی باتیں اپنی مقناطیسی شخصیت کی باتیں

"یار ــــ ثروت سے کل کار میں کیا باتیں ہوئیں۔" اس نے یکایک رک کر آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک درست کرتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں پوچھا ــــ "کوئی خاص بات نہیں وہ بے حد کم سخن ہیں"

میں نے جواب دیا

"کم سخن۔" اس نے مصنوعی حیرت سے پوچھا اور پھر گونجتا ہوا قہقہہ لگایا "یار ــــ تم عورت کے معاملے میں نرے بدھو ہو، خدا کی قسم یار ہے پارہ۔ تمہیں کیا خبر کہ اس کے بظاہر سرد جسم میں آگ کی کتنی بھٹیاں سلگ رہی ہیں"

"چھوڑو بھی یہ فضول سی باتیں۔ فلم کی کاسٹ کب چن رہے ہو؟" میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی

"ساری کاسٹ تیار ہے، صرف ہیروئن کی تلاش ہے۔ ایک نیا چہرہ چاہتا ہوں، جوان ہو جسم جاذب نظر ہو خوبصورت ہو اور اچھے خاندان سے ہو۔" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ "تو ملی کوئی"

"ملی تو ہے لیکن ہتے نہیں چڑھتی ــــ یعنی کہ آپ واقعی احمق ہیں جناب عالی ــــ آپ کا کیا خیال ہے میں نے ثروت کو اتنی لفٹ کیوں دے رکھی ہے؟" اس نے جھنجھلا کر پوچھا

"ثروت کو کیا وہ فلموں میں آنا چاہتی ہیں؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا

"ارے بابا ــــ رونا تو یہی ہے کہ اس نے خواہ مخواہ اپنی پارسائی کا ڈھونگ [illegible] کہتی ہے

Join eBooks Telegram

امی اجازت نہیں دیگی۔ ابا جان سے مار ڈالیں گے ۔۔۔ وغیرہ وغیرہ

"ہوسکتا ہے، ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے رائے ظاہر کی

"بکتی ہے یار۔ انتہائی فلرٹ ہے۔ وہ میں ذرا سا لفٹ دوں تو بس میرے گلے کا ہار ہو جائے۔ عاشق

کی ایک طویل فہرست ہے۔" ۔۔۔ وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ میں نے اسے روکا مجھے اسکی باتوں سے

سخت کوفت ہو رہی تھی "اب چپ بھی ہو جاؤ اعظم ۔۔ خدا کے قہر سے ڈرو کیوں کسی کنواری لڑکی کو بدنام

کر رہے ہو؟" میں نے اسے ڈانٹ پلائی

"اچھا جی ایک ہی ملاقات میں اتنی ہمدردی ہو گئی خیر کوئی بات نہیں، بہت جلد پچھتاؤ گے، ادل نمبر

کی خود غرض ہے۔ وہ ایسا داغ دے گی کہ عمر بھر یاد رکھو گے بندہ آج کے بعد پھر کبھی اس موضوع پر گفتگو نہیں کرے گا"

یہ کہتے ہوئے اس نے موضوع بدل دیا اور میرا گھنٹہ بھر ضائع کر کے چلا گیا۔

اس واقعہ کے بعد شروت سے اکثر ملاقاتیں ہونے لگیں، مختصر سی ملاقاتیں۔ اکثر اعظم کے دفتر میں اور کبھی کبھی

کسی ادبی جلسے میں، ہم بہت جلد اچھے دوست بن گئے

ایک شام میں دفتر سے نکل رہا تھا کہ اس نے ٹیلیفون کیا "آج شام کیا کر رہے ہو"

"کچھ نہیں" ۔۔۔ "میں آوارہ گردی کروں گا" میں نے جواب دیا

"ایک شریف معصوم انسان کی طرح سیدھے ہمارے یہاں آجاؤ ۔۔۔ ساتھ چائے پئیں گے"

"بہتر ۔۔۔ خدا حافظ"

"خدا حافظ نہیں شام بخیر کہو پہلی بار ہمارے یہاں آ رہے ہو" اس نے شرارت سے کہا اور ریسیور رکھ دیا

مجھے وہاں پہنچتے پہنچتے چھ بج گئے، کوٹھی سڑک سے ذرا اندر کی طرف گلی کے نکڑ پر چھوٹی سی زرد دو

منزلہ کوٹھی تھی۔ وہ باہر لان میں ایک طرف بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے کتاب

رکھ دی، مسکرائی اور اٹھ کر سلام کیا "آئیے جناب" "تشریف لائیے" ۔۔۔ "یہ میرا باغیچہ ہے جس سے مجھے

عشق ہے ۔۔۔ یہ لیجیے کرسی" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور ہم دونوں بیٹھ گئے، کوٹھی

کے تین طرف باغیچہ تھا، لان کے کنارے کیاریاں تھیں، جن میں رنگ برنگے پھولوں کے گچھے سر اٹھائے

کھڑے تھے، شہ نشین پر چھوٹے چھوٹے گملے رکھے ہوئے تھے جن میں سے لمبی لمبی الجھی ہوئی سبز بیلیں

نیچے لٹک رہی تھیں، گرد و پیش کے اس حسین پرسکون ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے میری نگاہیں اس پر

Join eBooks Telegram

تیں ، وہ ان بے شمار غنچوں کے درمیان ایک چھوٹی سی آرام کرسی میں دھنسی بیٹھی تھی ۔ آج اس
ھر ساڑی باندھ رکھی تھی ، سفید جارجٹ کی ساڑی تھی جس پر بہت چھوٹی چھوٹی سی بے شمار
ں تھیں ، طاؤسی رنگ کا چست بلاؤز تھا ۔ آڑھی مانگ اور دو گھنی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں تھیں
ج بھی میک اپ کی آلائشوں سے پاک تھا اور اس پر معصومیت تھی ، دوشیزگی کا نکھار تھا ، تازگی
گفتگی تھی ۔ اس کی سفید رنگت پر ان سادہ مگر جاذب نظر کپڑوں کا امتزاج بیحد بھلا لگ رہا تھا
ند لمحے خاموش اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ۔ اس نے مجھے یوں گھورتے دیکھا تو بری طرح
پ گئی اور اسکے چہرے کی رنگت میں سرخی ابھر آئی اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی
یں نے سوچا ــــ اسکی خوابیدہ تبسم آنکھیں کس قدر نرم اور معصوم ہیں !

یوں گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟ اس نے آہستہ سے پوچھا ، یوں جیسے ۔
جانتی ہو لیکن کسی وجہ سے مجبور ہو

دیکھتا تو ہے پر حسین شکلیں ــــ !"

فضول باتیں چھوڑو " اس نے فوراً مجھے ٹوکا ، "مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا ہے ۔ تم میری اگر حوصلہ
ی نہ کرتے اور ریہرسل نہ کراتے تو میرا دم ہی نکل جاتا ۔ میں اعظم اینڈ کمپنی پر واضح کر دینا چاہتی تھی کہ اگر
چاہوں تو اچھی اداکاری کر سکتی ہوں " اس نے گردن اٹھا کر ذرا فخر سے کہا ۔

تم نے واقعی کمال کر دیا تھا ــــ مجھے خوشی ہے کہ میری شاگرد اتنی ذہین ہے ۔ میں نے اسکی
یف کی تو وہ خوش ہو گئی اور مسکرانے لگی اور میں نے سوچا ــــ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ یہ اپنی
سنجیدگی کے باوجود جب ذرا سا بھی مسکراتی ہے تو اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے ، یوں جیسے نسیم سحری
کے ساتھ حسین غنچے اپنا منہ کھول دیتے ہیں ۔ ہونٹوں کے علاوہ اسکی آنکھیں تک مسکرانے لگتی ہیں
میں نے آج تک ایسی حسین تبسم آنکھیں نہیں دیکھی تھیں

ذرہ نوازی کا شکریہ جناب ــــ لیکن میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ میں اعظم صاحب کی آرزو
پوری کر دوں گی ــــ مجھے فلموں کے ماحول سے نفرت ہے ــــ آج دراصل مجھے تم سے
ساری اہم باتیں کرنی ہیں " اس نے دھیمے لہجے میں کہا

اہم باتیں ؟ ــــ مجھے تو بھیا ڈر لگتا ہے " میں نے مصنوعی گھبراہٹ سے کہا ۔

Join eBooks Telegram

ڈر نہیں، میں لاکھ بری سہی لیکن میں تمہارے لئے بے ضرر ہوں، اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اتنے میں چائے آ گئی اور ہماری گفتگو کچھ دیر کیلئے رک گئی۔

آج گھر پر کوئی نہیں ہے، اس لئے ہم آزادی سے خواجہ اعظم پر لعنتیں بھیج سکیں گے، اس نے کیک کی پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں خواجہ اعظم سے اتنی چڑ ہے تو اب بھی اس سے کیوں ملتی رہتی ہو؟" میں نے چائے کا گھونٹ لیکر

"تفریح کی خاطر ـــــ وہاں دلچسپ گیت سننے کو ملتے ہیں، شہر بھر کے اسکینڈلز کا حال معلوم ہو جاتا ہے کل میں نے تمہارا گیت بھی وہیں سنا تھا ـــــ نیل گگن پر تھا اک تارہ ـــــ"

"پسند آیا؟"

"پسند؟ بخدا کل زندگی میں پہلی بار مجھے اس کا افسوس ہوا کہ مجھے گانا نہیں آتا ورنہ اعظم صاحب کی تمام خطرناک نیتوں کے باوجود میں ان کی فلم میں ضرور یہ پارٹ ادا کرتی اور یہ گیت خود گاتی اللہ میاں نے نہ جانے کیوں مجھے اس تفریح سے محروم رکھا"

"تم ہر چیز کو تفریح کیوں سمجھتی ہو؟" میں نے پوچھا

"نہ سمجھوں تو ہماری دکھوں کی اس دنیا میں زندگی دوبھر ہو جائے"

"ٹھیک ہے لیکن زندگی کے یہ کھیل کبھی کبھی خطرناک صورت بھی تو اختیار کر سکتے ہیں ثروت ـــــ اگر کبھی ایسا ہوا تو بتاؤ تمہیں بھنور سے نکالنے کیلئے سمندر میں کون کودے گا" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ وہ چند لمحے خاموش مجھے دیکھتی رہی، یکایک اس نے ایک جھرجھری سی لی اور میز پر دونوں کہنیاں ٹیکے اور مجھ سے قریب ہو کر دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"کیوں؟ ـــــ کیا میں اتنی بری ہوں کہ کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا، آج پہلی بار اسے اتنے قریب سے دیکھا تھا، اتنے قریب سے دیکھنے پر مجھے اسکی آنکھیں اور بھی بڑی بڑی معلوم ہوئیں، پلکیں لمبی لمبی اور باریک تھیں اور اوپر کو مڑی ہوئی تھیں اسکی چمکتی ہوئی بھوری پتلیوں میں مجھے اپنی چھوٹی سی تصویر نظر آئی جو بے حد مضطرب تھی اس کے بالوں میں سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی اب کے میں نے ایک جھرجھری سی لی اور بے اختیار آنکھیں بند کر لیں اور ایک سانس اندر کی طرف لیا تاکہ خوشبوؤں کا یہ سیلاب میرے دماغ

Join eBooks Telegram

میری روح میں بس جائے

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟" میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں

"یہ سوال تم نے مجھ سے کیوں کیا؟ —— تمھیں اس کا جواب معلوم ہونا چاہئے" میں نے آہستہ سے جواب دیا

"معلوم ہے —— لیکن کچھ باتیں تمھارے منہ سے سننا چاہتی ہوں —— یہ بتاؤ —— تم مجھ سے دلچسپی کیوں لینے لگے ہو۔"

"کیوں اعتراض ہے تمھیں؟"

"نہیں، لیکن میں جاننا چاہتی ہوں، اس لئے جاننا چاہتی کیوں کہ مجھے معلوم ہے میں ایک بالکل ولی لڑکی ہوں، مجھ میں کوئی خاص بات نہیں، آج تک جس نے بھی مجھ میں دلچسپی لی وہ مجھے صرف تفریح طبع کرنا چاہتا تھا، تم پہلے شخص ہو جس کی صاف گوئی میں مجھے اپنائیت نظر آئی —— خلوص معصومیت اور ہمدردی —— ان سب کی وجہ سے یقین نہیں آتا کہ تم بھی اوروں کی طرح خودغرض ہو لی۔ "بتاؤ —— تم مجھ سے اتنی دلچسپی کیوں لینے لگے ہو؟" چند لمحے خاموشی رہی۔

پھر میں نے آہستہ سے کہا، "تمھارے سوال کا فی الحال میرے پاس کوئی جواب نہیں۔"

"تو نہیں تم میرے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتے۔ کیا تمھیں معلوم ہے عرصہ ہوا میں نے اپنا ایک عزیز رشتہ کھو دیا تھا؟"

"معلوم ہے۔" اس نے غالباً سنا نہیں کیوں کہ وہ کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی

"کل تم گا رہے تھے ؏ نگاہیں در پہ لگی ہیں اداس بیٹھے ہیں
کسی کے آنے کی ہم لے کے آس بیٹھے ہیں

اور بے اختیار وہ رو پڑی اس نے دونوں ہاتھوں کو زور سے بھینچا اور آنکھیں بند کر لیں اس آواز میں بلا کا تاثر تھا، درد تھا، کسک تھی، غم کے مارے اس کا سارا جسم کانپ اٹھا اور مجھے بے اختیار والیٹی کی وہ شام یاد آگئی اور میں بے چین ہو گیا وہ چند لمحے خاموش آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی اور اس نے جذبات پر قابو پا لیا اور آہستہ سے آنکھیں کھول دیں اور سر اٹھا کر چاروں طرف یوں دیکھنے لگی جیسے خواب دیکھتے دیکھتے جاگی ہو، چہرہ حد درجہ اداس تھا، سر کے بال بکھر گئے تھے اور معصوم آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں —— میری طرف یوں ہمدردی اور پیار سے نہ دیکھو، میرے پاس کچھ

Join eBooks Telegram

بھی تو نہیں جو میں تمھیں دے سکوں مجھے زندگی کی اُن تفریحوں سے جو عشق ہے وہ ایک ڈھکو
سلا ہے، اپنے غم اور دکھوں کو چھپانے کی ایک کامیاب کوشش، میرے سینے میں تو وہ غم ہے جس میں ار
اور مایوسی اور حسرت و یاس کی گہری خاموشی پوشیدہ ہے ـــــ مجھے یوں پیاسے کیوں دیکھ رہے
ہو؟ ـــــ میرے اچھے دوست! یہاں سے تمھیں کچھ نہیں ملے گا ـــــ بالکل نہیں ملے گا ــ
"ثروت! اور میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا ـــــــــــــــ

"مجھے معاف کر دو، میں واقعی احمق ہوں، آج مدت کے بعد جذباتی باتیں کیں تو خواہ مخواہ جی بھر آیا آج
میں صرف اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے اور یہ کہ مجھے تمھاری دوستی پر فخر ہے اگر کبھی
یوں ہوا کہ ہم ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئے تو اس کا یقین رکھنا کہ ثروت خود غرض نہیں وہ واقعی تمھاری
دوست تھی اور وہ اتنی بری نہیں تھی جتنی کہ دنیا سمجھتی تھی ـــــ!"

وہ دھیمے لہجے میں بولی اور نہ جانے کیوں مجھے اعظم کی باتیں یاد آگئیں اور پھر "کنہ دالیٹی" کی
وہ شام یاد آگئی ـــــ کیا واقعی وہ ثروت ہی تھی۔

سمندر کی ایک تیز موج چیختی ہوئی آئی اور ہماری کشتی سے ٹکرائی اور کشتی ایک طرف کو جھک گئی اس
سے پہلے کہ ملاح تیزی سے اس تختے پر جا بیٹھتا جو کشتی کا وزن برابر رکھنے کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا
ثروت تختے پر چڑھ گئی، میرے اور عارفہ کے منہ سے ایک ساتھ چیخیں نکل گئیں اور ثروت بادبان
کے رسیوں کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی

[illegible] خدا کی قسم تم سب ڈرپوک ہو یہاں آجاؤ عارفہ اور میرے ساتھ یہاں کھڑی
ہو کر دیکھو تو تمھیں سمندر کی وسعت اور اس کے حسن کا صحیح اندازہ ہو گا، تم منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہو؟
اس نے جھک کر محبت سے پوچھا۔ کیا عارفہ کی طرح تمھیں بھی ڈر ہے کہیں ان منہ زور لہروں میں کھو نہ جاؤ
ـــ پاگل نہ بنو اور فوراً تبسم کی وہ غزل سناؤ جو مجھے بیحد پسند ہے۔ اس پاگل کر دینے والے موسم میں
لطف آجائے گا۔

بوندا باندی اب بھی جاری تھی، ہم ساحل سے قریب پہنچے لیکن سمندر بھوکے شیروں کی طرح ہمارے
چاروں طرف غرا رہا تھا اور کشتی ہچکولے کھا رہی تھی، ہماری کشتی سے کچھ فاصلے پر نوجوان طلبا کی ایک
اور کشتی تیزی سے ہچکولے کھاتی ہوئی شہر کی طرف جا رہی تھی ہم شاید اب منوڑا سے قریب تھے دور

Join eBooks Telegram

کستانی بحریے کے کئی جہاز لنگر ڈالے کھڑے تھے۔ ثروت میری برساتی پہنے بادبان کے رسوں کا سہارا لئے منگے
یر اس تختے پر کھڑی تھی جو کشتی سے باہر سمندر کی سطح پر نکلا ہوا تھا اور میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا
کشتی یکایک ہچکولے کھانے لگی تو ملاح اپنے بوڑھے ساتھی کو بلوچی میں کچھ سمجھانے لگا

"آپ بیٹھ جائیے بی بی ——— بارش کی وجہ سے تختے پر پھسلن ہے" بوڑھے نے چیخ کر ثروت سے کہا
بابا! مجھے ان ہچکولوں میں مزا آرہا ہے ——————— مجھے زبردستی بٹھا کر مجھ سے تفریح
کا سامان نہ چھینو۔ میں یہاں تفریح کیلئے آئی ہوں ——— تم ڈرو نہیں بابا ——— اگر میں سمندر میں گر بھی
گئی تو یہ بابو فوراً چھلانگ لگا کر مجھے بچالیں گے ——— ہاں جناب ادیب صاحب! ——— میں نے ایک
غزل کی فرمائش کی تھی لیکن افسوس صد افسوس۔ سب منہ پھلائے بیٹھے ہیں ——— عارفہ تم اور حامد
صاحب اور خواجہ اعظم صاحب ——— تم سب ——— اور تم بھی!"

اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں ہاتھ اٹھا کر میری طرف اشارہ کیا ؎

"الٰہی کیا مری رخصت کا وقت آپہنچا
یہ چارہ ساز مرے کیوں اداس بیٹھے ہیں"

شعر پڑھتے ہوئے اس نے سر سے ایک جھٹکے سے اپنے باغی بال درست کئے اور سنبھل کر بیٹھنے کی کوشش
کر رہی تھی کہ ——— یکایک کشتی ایک طرف کو جھک گئی اور اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال سکتی اس کا
پیر پھسلا اور وہ دھم سے سمندر میں جا گری

یکایک ہر چیز گڈمڈ ہو گئی اور دھند سی چھا گئی ——— جب ہوش آیا تو اطلاع ملی اسے بچانے کی
کوشش میں خود میری جان خطرے میں پڑ گئی تھی ——— ثروت! میری عزیز دوست ——— کہاں ہو تم

ماہنامہ **تحریک** دہلی
مدیران: گوپال متل، تمکین کاظمی، مخمور سعیدی
ایک سنجیدہ، علمی، ادبی ماہنامہ
فی پرچہ ۲۰ / ۳ روپیہ — سالانہ چندہ ۱۴ روپے
۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

Join eBooks Telegram

اختر لکھنوی

بات کھوتے جو التجا کرتے
اے دلِ نامراد کیا کرتے

اب ستم ڈھلتے ہیں کھلے بندوں
عکس سے اپنے جو حیا کرتے

ہائے کیا لطفِ داستاں ہوتا!
کہتے ہم اور وہ سنا کرتے

ہم ہیں اب اور کنجِ تنہائی
لے کے گملے کبھی پھرا کرتے

شرحِ بیدادِ آرزو معلوم
چپ نہ رہتے اگر تو کیا کرتے

کچھ کہا اور یہ کھنچ گئے ابرو!
کس طرح شرحِ ماجرا کرتے

تیرے در کے گدا ہیں مستغنی
کیا ہوسِ خلد کی بھلا کرتے

ہیں ستائے ہوئے بتوں کے اثر
ورنہ یہ اور خدا خدا کرتے

Join eBooks Telegram

اثر لکھنوی

صد شکر ابھی ذوقِ نظر عام نہیں ہے — کب جلوہ نما شاہدِ بے نام نہیں ہے

اچھا ہوا غش کھا کے گرے حضرتِ موسیٰ — اب ہوش میں رہنے کا تو الزام نہیں ہے

طوفِ حرمِ عشق میں پروانوں کے مانند — شعلے کے سوا جامۂ احرام نہیں ہے

اب ہے یہ سیہ مستیٔ میخوار کا عالم — اک نقشِ تحیّر ہے خطِ جام نہیں ہے

ہم دل میں کسی سے کبھی کینہ نہیں رکھتے — یہ شیوۂ رندانِ مئی آشام نہیں ہے

تو حور کسے کہتا ہے اے زاہدِ خوش خو! — اصنام کی فہرست میں یہ نام نہیں ہے

کرتی ہے اشارے سحرِ تازہ دمیدہ — اٹھ مردِ خدا خواب کا ہنگام نہیں ہے

جو دل میں ہے سنتا ہوں وہی وقتِ خبر میں — اب آرزوئے نامہ و پیغام نہیں ہے

یا ہنسنے ہنسانے کے سوا کام نہیں تھا — یا رونے رلانے کے سوا کام نہیں ہے

جی بھر کے انھیں دیکھ لے اے دل دمِ آخر — کمبخت تڑپنے کا یہ ہنگام نہیں ہے

یہ داغِ جگر ہے اثرؔ سوختہ اختر — گلنار شفق سے ورقِ شام نہیں ہے

Join eBooks Telegram

علامہ محوی صدیقی لکھنوی

کیا پوچھتے ہیں آپ کہ کیوں رو رہے ہیں ہم | اک داغ ہے حیات جسے دھو رہے ہیں ہم

اپنی نظر ہی اب ہمیں دینے لگی فریب | برسوں ادا شناسِ نظر گو رہے ہیں ہم

منزل بھی اک فریب نہ ہو ہمسفر کہیں | منزل کی ہمت شوق سے جا تو رہے ہیں ہم

احساسِ غم ہے اور مداوائے غم نہیں | دل اپنا جاگتا ہے مگر سو رہے ہیں ہم

کونین اک گناہ کی قیمت نہیں تو پھر | یہ زندگی جو تیرے لئے کھو رہے ہیں ہم

محرومِ دید چشمِ امید اور صبحِ عید | دنیا تو ہنس رہی ہے مگر رو رہے ہیں ہم

زنداں میں کون پوچھنے آتا ہے اب ہمیں

محوی وطن میں یاد ہی کس کو رہے ہیں ہم

Join eBooks Telegram

شادؔ عارفی

غزل

اداسیوں کی چھاؤں کو سمجھ رہے ہیں نور ہے ۔ یہ آپ کی تمیز ہے، یہ آپ کا شعور ہے

جہاں میں رہ رہا ہوں نام اسکا رامپور ہے ۔ جبھی تو قدر دانیٔ ادب سے دور دور ہے

بیان کر رہا ہوں اس کے منہ پہ اسکی خامیاں ۔ برس پڑے جو مجھ پہ بزمِ دوست بے قصور ہے

جسے وطن فروش کہکے ہونٹ کاٹتے ہیں ہم ۔ وہ اکتسابِ زر کے سلسلے میں ذی شعور ہے

شگوفہ جواں کی طرح کھلکے مسکرائیے ۔ نہ سوچئے خزاں چمن کے پاس ہے کہ دور ہے

جہاں نظامِ نو کی "کینہ پروری" پہ طنز جائیے ۔ وہاں عدو کے لب پہ "جی بجا ہے" جی حضور ہے

اگر لحاظِ اسم رہنما، ضرور ہے انھیں ۔ تو کارواں کی عافیت کا پاس بھی ضرور ہے

اگر میں اٹھ چلوں کہیں گے مے کا اہل ہی نہ تھا ۔ اگر میں جام توڑ دوں کہیں گے بے شعور ہے

زمانہ ان کے باب میں کریگا، شادؔ فیصلہ ۔ وہ، کھو کھلے، کہ جنکو فنِ شعر پہ غرور ہے

Join eBooks Telegram

جذبی

غزل

چمن میں شورِ عنادل رہے رہے نہ رہے
حریفِ نوا کے مقابل رہے رہے نہ رہے

فسردگی ہی جو ٹھیری ہے زیست کا حاصل
تو پھر یہ زیست کا حاصل رہے رہے نہ رہے

کسے خبر کہ یہ صحرائے آسمان و زمیں
جنونِ شوق کے قابل رہے رہے نہ رہے

جمی ہوئی ہیں نگاہیں سوادِ منزل پر
نشانِ جادۂ منزل رہے رہے نہ رہے

یہ سوچتے ہوئے طوفاں میں ڈال دی کشتی
کہ پھر اشارۂ ساحل رہے رہے نہ رہے

دہانِ زخم جو منہ پھیر لیں تو کیا معلوم!
تبسمِ لبِ قاتل رہے رہے نہ رہے

ہمیں تو ناصحِ ناداں شرارِ زیست سے کام
تصادمِ نگہ و دل رہے رہے نہ رہے

Join eBooks Telegram

غزل

احمد ندیم قاسمی

لب خاموش سے افشا ہوگا
راز ہر رنگ میں رسوا ہوگا

دل کے صحرا میں چلی سرد ہوا
ابر گلزار پہ برسا ہوگا

تم نہیں تھے تو سر بام خیال
یاد کا کوئی ستارہ ہوگا

کس توقع پہ کسی کو دیکھیں
کوئی تم سے بھی حسیں کیا ہوگا

زینت حلقۂ آغوش بنو
دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا

ظلمت شب میں بھی محبوب ہو تم
درد چمکے گا تو پھر کیا ہوگا

جس بھی فن کار کے شہکار ہو تم
اس نے صدیوں تمہیں سوچا ہوگا

آج کی رات بھی تنہا ہی کٹی
آج کا دن بھی اندھیرا ہوگا

کس قدر کرب سے چٹکی ہے کلی
شاخ سے گل کوئی ٹوٹا ہوگا

عمر بھر روئے فقط اس دھن میں
رات بھیگی تو اجالا ہوگا

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہوگا

Join eBooks Telegram

عبدالمجید حیرت

فکر کا یہ انداز غلط ہے
ناز برائے ناز غلط ہے

یا مطرب کا ساز غلط ہے
یا اسکی آواز غلط ہے

بے سمجھے اقدام، حماقت
بے سوچے پرواز غلط ہے

کل بھی حرص و آز غلط تھی
آج بھی حرص و آز غلط ہے

کل بھی حشر غلط ہی ہوگا
آج اگر آغاز غلط ہے

دیکھ رہی ہے جب اک دنیا
راز رہے گا راز غلط ہے

ہے تو نشانہ زد کے اندر
لیکن تیر انداز غلط ہے

گلشن میں پھولوں کے ہوتے
کانٹوں کا اعزاز غلط ہے

یہ امید کہ بے ہوشی سے
ہوش کریگا ساز غلط ہے

تیرا یہ اندازِ تکلم
اے میرے دمساز غلط ہے

ان کی بزمِ ناز میں حیرتؔ
ہم! اور سرافراز غلط ہے

Join eBooks Telegram

سلیمان اریب

غزل

زمیں کا گیت قمر کو سنا دیا ہم نے
زمیں پہ رہ کے فلک کو جھکا دیا ہم نے

کبھی نہ ہو سکی تاریک رہگذارِ حیات
اگر چراغ بجھے دل جلا دیا ہم نے

جہاں کہیں بھی نظر آ گیا ہو حسن ہمیں
خدا سمجھ کے وہیں سر جھکا دیا ہم نے

کوئی رکھے نہ رکھے یاد اب یہ عالم ہے
خود اپنے آپ کو دل سے بھلا دیا ہم نے

ہمارے فیضِ سخن کا زمانہ شاہد ہے
جو کچھ نہ تھے انھیں کیا کچھ بنا دیا ہم نے

Join eBooks Telegram

محمود ایاز

غزل

وقت کس یاد کے محور پہ رکا	گردشِ دورِ جہاں خواب میں ہے

کس کی صورت ہے سرِ بزمِ خیال	دلِ بیتابِ نغاں خواب میں ہے

جستجو دشتِ طلسمات میں گم	شوق کا سیلِ رواں خواب میں ہے

سرو سامانِ تمنّا کھو کر	حسرتِ دلِ زدگاں خواب میں ہے

ایک سناٹا ہے عالم پہ محیط	نفسِ نغمہ گراں خواب میں ہے

درد اظہار کی لے بھول گیا
نالۂ غم زدگاں خواب میں ہے

Join eBooks Telegram

وحید اختر

غزل

نرم اجالے، چاندنی شب کے دن کی تمازتیں نہ ملیں گے

نیند میں جو سپنے دیکھے ہیں، عمر تمام نہ سونے دیں گے

اب نہ امیدِ دید نہ حسرت، آنکھیں کس کو ڈھونڈ رہی ہیں

ان کی تمنا، ان کا تصور، جینا ہے تو یوں بھی جئیں گے

ہم نے جیسے گریباں چھوڑا تھا وہ گل افسردہ نہ ملے گا

آئیں گی ہر سال بہاریں، ڈالی ڈالی پھول کھلیں گے

ہنستے چہرے، میٹھے فقرے، جلد نقاب الٹ دیتے ہیں

لفظ اگر خاموش رہیں تو ان کے معانی بول اٹھیں گے

خود کو سنبھالو، آنکھیں پونچھو، دیکھ لے گر دنیا تو غضب ہے

وجہ سبب غم کا پوچھیں گے، دشمن ہنس کر طنز کریں گے

غزلیں کہنا، نظمیں لکھنا، علم و ادب پر بحثیں کرنا

ہجر میں کوئی کام نہیں تو عمر سے اتنا کام ہی لیں گے

Join eBooks Telegram

شہریار

غزلیں

دل سے ممکن ہو تو وہ خو بدلے
یہ تو مشکل ہے کہ اب تو بدلے

کیا کسی خواب کی وحشت جاگی
کیوں در و بام نے پہلو بدلے

پھر شبِ غم کا سکوں ٹوٹ گیا
پھر تری یاد نے پہلو بدلے

کچھ تو بتلائیں ہمیں اہلِ چمن
گل بدل جائیں کہ خوشبو بدلے

شکوہ کرتے ہیں چشم و لب کس کا
ساتھ دیتا ہے کوئی کب کس کا

شمع خاموش تھی تو محفل میں
نام لینے لگے تھے سب کس کا

ہلے یہ ڈر کہ کوئی پوچھ نہ لے
دھیان رہتا ہے روز و شب کس کا

قافلے آئے بھی چلے بھی گئے
ہے ہمیں انتظار اب کس کا

دل کے ہونے نے ہر قیامت کی
اور ہے یہ قصور سب کس کا

Join eBooks Telegram

غزل

بشیر بدر

یہ نگر آباد ہے بیداد سے
قصرِ دل مضبوط ہے بنیاد سے

چاند تارے ہیں نظر میں داغ داغ
رات روشن ہے کسی کی یاد سے

ہم فروغِ جور کے پروردہ ہیں
درد کی صورت بڑھے بیداد سے

دل میں آ دیکھو جہاں آباد ہے
یوں بہت ہیں خانماں برباد سے

وقت کے ہاتھوں پہ بیٹھا وہ بھی تھا
ہم ملے ہیں جس ستم ایجاد سے

اپنا دل جب اپنے قابو میں نہ ہو
کیا شکایت پھر کسی کی یاد سے

دل کی پوچھو تو اسیروں کے اسیر
دیکھنے میں ہیں مگر آزاد سے

Join eBooks Telegram

سوغات

بشیر بدر

پتھروں کو ہوا چاہت کا جنوں آپ سے آپ
کام آیا دلِ فنکار کا خوں آپ سے آپ

زندگی کو کبھی آلودۂ ساغر نہ کروں
میں ترے غم کو اگر بھول سکوں آپ سے آپ

تم تو خود شعروں میں رچ بس کے مہک جاؤ گے
میں خطاوار اگر نام بھی لوں آپ سے آپ

ایک مدت ہوئی مرجھا چکے زخموں کے گلاب
دلِ بے رنگ کا کیا رنگ کروں آپ سے آپ

یہ توقع نہیں پوچھے گا کوئی غم میرا
اور ممکن نہیں میں کہتا پھروں آپ سے آپ

زہر کا جام ترے ہاتھوں سے ہے آبحیات
بے مزہ ہے میں اگر میٹھے بھی پیوں آپ سے آپ

اور دو چار اسے ٹھوکریں کھا لینے دو
عقل ہو جائے گی پابندِ جنوں آپ سے آپ

Join eBooks Telegram

بشیر بدر

دنیا تری باتوں کا یقیں آنے لگا ہے
آج اس کی محبت نے بھی دیوانہ کہا ہے

کس خوف سے سناٹے کا دل کانپ رہا ہے
کیا رات گئے پھر درِ میخانہ کھلا ہے

کس دیس میں یہ قافلۂ شوق رکا ہے
عارض کے اجالے ہیں نہ زلفوں کی گھٹا ہے

یہ بات الگ کون برا کون بھلا ہے
ہر کام محبت کا بہرحال برا ہے

جب اس کی گلی چھوٹی ہے دل بیٹھ گیا ہے
اس یارِ وفادار نے بھی دھوکا دیا ہے

میں نے تری باتوں کو کبھی جھوٹ کہا تھا
اس جرم پہ ہر جھوٹ کو سچ مان لیا ہے

کچھ میری نگاہوں کے تلے دھند بہت ہے
کچھ جشنِ چراغاں سے اندھیرا بھی بڑھا ہے

اے شوخ غزالو! یہاں دو پھول تو رکھ دو
اس قبر میں خوابیدہ محبت کا خدا ہے

اب آؤ کلیجے سے لپٹ کر مرے سو جاؤ
باہر کہاں جاؤ گے بڑی سرد ہوا ہے

عارض سے جھلکتی ہے گلابوں کی گلابی!
میری نگہِ شوق نے وہ رنگ دیا ہے

کچھ دیر میں سانسوں کی بھی آہٹ نہ ملے گی
دل رات کے سناٹے میں یوں ڈوب رہا ہے

Join eBooks Telegram

پرویز شاہدی

غزل

منزل بھی ملے گی رستے میں تم راہگزر کی بات کرو

آغازِ سفر سے پہلے کیوں انجامِ سفر کی بات کرو

ظالم نے لیا ہے شرما کر پھر گوشۂ داماں چٹکی میں

ہے وقت کہ تم بیباکی سے اب بندِ سُتر کی بات کرو

آیا ہے چمن میں موسمِ گل، آتی ہیں ہوائیں زنداں تک

دیوار کی باتیں ہو لیں گی اس وقت تو در کی بات کرو

ہے تیز ہوا، ہلتا ہے قفس خطرے میں پڑی ہے ہر تیلی

فریادِ اسیری بند کرو اب جنبشِ پر کی بات کرو

کیوں دار و رسن کے سائے میں منصور کی باتیں کرتے ہو

رکھنا ہے جو اونچا سر اپنا تو اپنے ہی سر کی بات کرو

Join eBooks Telegram

شفا گوالیاری

ب کر کے اشکِ غم ظرفِ دل اجلتا ہے ۔۔۔ سو چراغ بجھتے اک چراغ جلتا ہے

ل زمیں کا ہلتا ہے، آسماں دہلتا ہے ۔۔۔ زندگی کا دھارا جب اپنا رخ بدلتا ہے

خیال ہیں ان کے اس طرح مچلتا ہے ۔۔۔ جیسے صبح کا تارا، ڈوبتا، اچھلتا ہے

ب ہر اک کو ملتی ہیں، لغزشیں محبت کی ۔۔۔ وہ بڑا ہی ناداں ہے گر کے جو سنبھلتا ہے

ھ ہیں ایسے رہرو بھی وقت کے جو ساتھی ہیں ۔۔۔ کچھ ہیں ایسے بھی جن کے وقت ساتھ چلتا ہے

ق یہ ہے شمعوں سے اب دھواں نہیں اٹھتا ۔۔۔ ورنہ اس شبستاں میں اب بھی خون جلتا ہے

وزِ غم میں تپ تپ کے خونِ دل نہیں بجھ کے ۔۔۔ اشک جو نکلتا ہے آفتاب اگلتا ہے

ہروانِ غربت کی پوچھیے نہ دشواری ۔۔۔ ہر نفس الجھتا ہے، ہر قدم پھسلتا ہے

اتواں سہاروں سے منزلیں نہیں ملتیں ۔۔۔ راہی ایسا مشکل سے چند گام چلتا ہے

ک طرف ہے بیداری، اک طرف گراں خوابی ۔۔۔ کوئی آنکھ ملتا ہے، کوئی ہاتھ ملتا ہے

اے شفاؔ نہ یہ پوچھو ایک شعر ڈھلنے میں
کتنا خون کھپتا ہے کتنا دل پگھلتا ہے

Join eBooks Telegram

[illegible]

راج نرائن رازؔ

بھونرے نے خول چھیڑا ہوتا

روپ کلی کا نکھرا ہوتا

آپ کے لب پر بات نئی ہے

کاش کہ دل بھی دھڑکا ہوتا

گیت نہیں آواز تو ہوتی

اے دل تو ہی دھڑکا ہوتا

جینے کی کچھ صورت بنتی

آنکھ نے دھوکا کھایا ہوتا

رازؔ نہ ہنستی مجھ پر موجیں

کاش سفینہ ڈوبا ہوتا!

Join eBooks Telegram

ندرت کانپوری

ندرتِ خیال

مری آہ موجۂ بوئے گل، مرا نالہ نالۂ گل فشاں
میں قفس نصیب تو ہوں مگر یہ قفس ہے حاصلِ آشیاں

ترے ذوق سے ہے وسیع تر مرا ذوق واعظِ بے خبر
تری رفعتوں میں ہیں پستیاں مری پستیاں ہیں بلندیاں

مری زندگی کا یہ حال ہے، ہمہ وقت تیرا خیال ہے
تری جستجو میں ہے چار سو، تری فکر میں ہے رواں دواں

وہ نظر کے سامنے آ ہی گیا، وہ جمال اپنا دکھا ہی گیا
مجھے آج تک یہ خبر نہیں کہ حجابِ ہوش ہے درمیاں

اسے صرف میں ہی سمجھ سکا کہ یہ رازِ خاص ہے عشق کا
تری چشمِ ناز ہے ممتحن، مرا ہر نفس ہے اک امتحاں

مری زندگی تری برہمی، مری زندگی تری بے رخی
مرے واسطے ہے سکونِ دل، مرے واسطے یہ سکونِ جاں

Join eBooks Telegram

شفقت تنویر مرزا

غزل

برسی ہیں وہ آنکھیں کہ نہ بادل کبھی برسے
اندازۂ غم کیا ہو مگر دیدۂ تر سے

وہ چارہ گری تھی کہ عزیزوں کی دعائیں
لوٹ آئی ہیں ماتم کیلئے بابِ اثر سے

آنکھوں کی چمک دل کیلئے موت بنی ہے
یاد آئی تری زیست نہیں رقصِ شرر سے

اک جبرِ مسلسل ہے عناصر کی کہانی
مختار کہے جاتے تھے جب نکلے تھے گھر سے

شاید کوئی منزل نہیں اس راہ میں پڑتی
واپس نہیں آتا کوئی یادوں کے سفر سے

کس عشرتِ رفتہ کی یہ وحشت اثری ہے
دل ڈوب گیا قربِ شبِ وصل کے ڈر سے

Join eBooks Telegram

شفقت تنویر مرزا

غزل

لوگ ہیں منتظرِ نورِ سحر مدت سے
میں بھی بیٹھا ہوں سرِ راہگزر مدت سے

مدتوں دار و رسن زیست کا عنواں رہے
موردِ سنگ ہیں اس شہر میں سر مدت سے

جسکی منزل کا نشاں تک بھی نہیں نظروں میں
کب سے اس راہ میں ہیں محوِ سفر مدت سے

وہ کوئی دشت و بیاباں ہو کہ آبادی ہو
بن چکے ہیں سبھی شعلوں کے نگر مدت سے

ریگزاروں میں ہے لوگوں کو ٹھکانوں کی تلاش
منتظر اپنے مکینوں کے ہیں گھر مدت سے

پابہ زنجیر ہیں امکان رہائی تو کجا؟
زنگ آلود ہیں زندانوں کے در مدت سے

Join eBooks Telegram

انور صابری

غزل

زندگی شکرِ مجسم کے سوا کچھ بھی نہیں
تیری یادوں کے حسیں غم کے سوا کچھ بھی نہیں

زہدِ نامحرم عرفاں کا خروشِ سجدہ
حسرتِ کوثر و زمزم کے سوا کچھ بھی نہیں

میرا مقصودِ تصور ترے جلوؤں کی قسم
تیری تصدیقِ مکرّم کے سوا کچھ بھی نہیں

صبحِ خنداں کی خنک تابِ تجلی اے دوست
گرمیٔ سینۂ شبنم کے سوا کچھ بھی نہیں

امتیازات کے عالم سے گزر کر دیکھا
میرا عالم ترے عالم کے سوا کچھ بھی نہیں

اب مرے واسطے اک اور جہاں پیدا کر
یہ جہاں لغزشِ آدم کے سوا کچھ بھی نہیں

Join eBooks Telegram

نصاکوثری

غزل

تسلیم و رضا میں شکوۂ غم بے جا بھی ہے اور بے جا بھی نہیں
انساں مشیت کا منشا سمجھا بھی ہے اور سمجھا بھی نہیں

یادوں کے سلونے سپنے ہوں یا صبحِ خیالِ نظارہ
وہ بزمِ گماں ہیں جلوہ فگن ہوتا بھی ہے اور ہوتا بھی نہیں

پرتو کو حقیقت کہنے میں انساں کو تامل لازم ہے
پھولوں ادھر چلمن میں اسے دیکھا بھی ہے اور دیکھا بھی نہیں

نظروں کی زبانی افسانہ، چہرے کی اداسی میں قصہ
بیمارِ محبت حال اپنا کہتا بھی ہے اور کہتا بھی نہیں

ہر غم کو بھلا بھی سکتا ہے، ہر غم کو بڑھا بھی سکتا ہے
ساغر ہے نشاط اندوزی کا دھوکا بھی ہے اور دھوکا بھی نہیں

بچپن میں جو ہم سے کھیلا تھا، جو آج بھی چھپ کر ملتا ہے
اس حسنِ جواں سے فی الجملہ پردا بھی ہے اور پردا بھی نہیں

اس محفل میں بیٹھے ہیں نصاؔ لیکن کچھ ایسے بیٹھے ہیں ہم
پھولوں میں کوئی کانٹا جیسے تنہا بھی ہے اور تنہا بھی نہیں

Join eBooks Telegram

فراق گورکھپوری

تعارف

اس نظم کے اشعار سمی تصوف کے اشعار نہیں ہیں بلکہ عظمت مجاز عظمت کائنات و عظمت انسان کے علم بردار ہیں، پوری نظم میں انسان کی عظمت اور مرکزی اہمیت کو اس طرح خوب خوب انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ یہ نظم انسان کا ایک شاندار MANIFESTO بن گئی ہے، اس نظم میں زندگی خود اپنی نظروں میں بلند ہو جاتی ہے، فراق صاحب نے اپنی کچھ پہلے کی نظموں میں انسان کے بڑے بڑے کارنامے گنوائے ہیں لیکن انسانی وجدان یا آتم گیان، ہر کارنامے سے بڑی چیز ہے، انسانی کارنامے کتنے بھی عظیم کیوں نہ ہوں وہ ہمیشہ انسانی وجود کے مقابلے میں ثانوی وجود کی حیثیت رکھتے ہیں، اس نظم میں فراق صاحب نے اسی انسانی وجود کی عظمت کا تعارف کرایا ہے

فنا ہے میری پرچھائیں، بقا کا میں مقدر ہوں
بہانہ موت کا ہوں زندگی کا سرِ اکبر ہوں

وہ نقطہ ہوں جو ہے کامل سکوں کامل روانی بھی
ٹھہر جاؤں تو نجم القطب چل جاؤں تو خنجر ہوں

یہ دل کا قول ہے، ہر جزو و کل میرے ہی پہلو ہیں
سمٹ جاؤں تو قطرہ ہوں جو پھیلوں تو سمندر ہوں

ہوں میں ہی صبح کا عالم ہوں میں ہی شام کی دنیا
کہیں روئے منور ہوں کہیں زلفِ معنبر ہوں

اگر سمجھیں تو ہر کیفِ نشاط و غم مجھی سے ہے
کسی گل کے رُخِ خنداں ہوں کسی کا دیدۂ تر ہوں

Join eBooks Telegram

بجائے خود ہوں میں محدودِ لامحدود کا مظہر
کبھی صحرائے بے پایاں کبھی زندانِ بے در ہوں

یہ کن نظروں سے سیکھا فنِ جراحی محبت نے
اتر جاتا جو رگ رگ میں ہے وہ باریک نشتر ہوں

بساطِ دل یہ اکثر مجھ سے سرگوشی میں کہتی ہے
رہی جو مدتوں آرام گہ اسکی وہ بستر ہوں

مرے تو کفر و ایماں بندۂ بے دام ازل سے ہیں
جہاں دیر و حرم جاروب کش ہیں میں وہ منبر ہوں

جبینِ موج جا کے جزر و مد پر ہے چمک میری
تہِ بحرِ حقیقت جو نہاں ہے میں وہ گوہر ہوں

بھلا سکتی نہیں یہ زندگی مجھکو قیامت تک
کہ ہوں افسانۂ ہستی زمانے کو میں ازبر ہوں

زمانے کو نہ جب اپنی خودی میں جذب کر پایا
یہ ہونا کوئی ہونا ہے نہ ہونے کے برابر ہوں

برابر پڑ رہی ہیں مجھ پر ان ہاتھوں کی پرچھائیں
سراسر خیر مقدم ہے جو وہ کھلتا ہوا در ہوں

اسی سے کر لو کچھ اندازہ میری بیکرانی کا
حیات و موت جس کے جزر و مد ہیں وہ سمندر ہوں

قوائے ناتواں سے بارِ الہام اٹھ نہیں سکتا
حقائق توں ہے جبریل کا وہ زورِ شہپر ہوں

وہ دل ہوں خاک کر ڈالا جلا کر سوزِ پنہاں نے
چراغِ خانہ سے لگ جائے جس میں آگ وہ گھر ہوں

مٹائیگا فلک کیا، مجھ سے یکتائے زمانہ کو
نہ کوئی نقشِ باطل ہوں نہ میں حرفِ مکرر ہوں

مجھی سے کائناتِ صورت و معنیٰ عبارت ہے
جو ہے ہر صیغۂ ہستی کا ماخذ میں وہ مصدر ہوں

سراسر پیش رو ہوں انقلاباتِ زمانہ کا
جو ہے استادِ دورِ چرخ کا وہ دورِ ساغر ہوں

مجھی سے ہیں وہ گردش میں مرے ہی گرد پھرتے ہیں
ہزاروں آفتابوں، ماہتابوں کا میں محور ہوں

Join eBooks Telegram

مری ہر سانس خود آغاز و انجام زمانہ ہے ‏ ‏ ازل کی صبح بھی میں ہوں ابد میں ہی صبح محشر ہوں

اٹھا لے اٹھ سکوں گا کیا، گراں ہوں اک زمانے پر ‏ ‏ ہر اک نے چوم کے چھوڑا ہے جس کو میں وہ پتھر ہوں

ارے چھوٹوں بڑوں کی ہمسری سے مجھکو کیا لینا ‏ ‏ خدا کے ہیں برابر ہوں اگر اپنے برابر ہوں

مرے ہر نقطے میں پوشیدہ دنیائیں معانی کی ‏ ‏ بظاہر حرف ہوں میں اک مگر دفتر کا دفتر ہوں

مرے ہر لفظ کے پردے میں ہیں دیوان کے دیوان ‏ ‏ بجائے خود جو شعرستان ہے وہ مختصر تر ہوں

وہ نورِ نفی ہوں اثبات کو جو پھونک کے رکھ دے ‏ ‏ بھرم اقرار کا اٹھ جائے وہ انکار اکبر ہوں

چھپوں جس وقت میں اڑ جائے یہ دنیا دھواں بن کر ‏ ‏ خزانے طاقتوں کے جس میں پنہاں ہیں وہ جوہر ہوں

سیہ بختی میں مضمر بے شمار و بیکراں صبحیں ‏ ‏ نہاں ہیں جس میں لاکھوں مہر وہ تاریک منظر ہوں

جہان رنگ و بو کیا ہے مرے رخسار کا پرتو ‏ ‏ چمن سے عکس جس کا وہ جمال آئینہ پرور ہوں

رگِ سنگ شیشہ و پیمانہ ہے اک کسک ساقی ‏ ‏ ازل سے اٹھ رہا ہے جو وہ دردِ قلبِ مضطر ہوں

بہت نازک ہیں یزداں اہرمن کے ربط کی باتیں ‏ ‏ اٹھے جو خیر کے پہلو سے ہیں وہ فتنۂ شر ہوں

جنونِ زندگی کا غیب سے ہوں سلسلہ جنباں ‏ ‏ زمانہ جس سے گردش میں ہے وہ سودا لیے سر ہوں

بنا آشیانہ لامکاں کے کنگروں پر ہے ‏ ‏ جہاں جھک جائے کعبہ اس حرم کا میں کبوتر ہوں

حوادث سے لڑوں تو کیا لڑوں لے دے کے ہیں دو دست ‏ ‏ پہ سالار مارا جا چکا جس کا وہ لشکر ہوں

مرا نام و نشاں کیا پوچھتے ہو پوچھنے والو!

تخلص ہے فراقؔ اہلِ محبت کا مقدر ہوں

Join eBooks Telegram

۔ شاد عارفی

شطرنج

پہلا رخ

فرش پر بیٹھے ہیں کچھ احباب سر جوڑے ہوئے
دوسری دنیا میں ___ اس دنیا سے منہ موڑے ہوئے
وہ ،، سپہ سالارِ بے لشکر ،، ہے، ان میں فرد فرد
ہے ،، بساطِ تنگ داماں جنکو میدانِ نبرد
دل غنی اس کا وثیقے پر، اسے رشوت پہ ناز
،، ڈانسر ،، اس کی بہن، اس کا چچا ،، بیلہ نواز ،،
اگلے وقتوں کا یہ ،، شہزادہ ،، تو وہ ،، جاگیردار ،،
اور یہ ،، نواب پھلکی جاہ ،، ___ وہ ،، بگٹ وقار ،،
قرض کی پیتے ہیں، لیکن دل میں کہتے ہیں کہ ہاں
،، باپ مر جائے، تو رکھیں رہن بستان و مکاں

Join eBooks Telegram

دوسرا رخ

"شاہ" جب نقشے[1] میں آجاتا ہے، "فرزیں[2]" کے سبب
دعوتیں دیتے ہیں دانتوں کو، طرف داروں کے لب

دوست میری مان! "شاہی چال" "پٹ پڑتی نہیں
قلعہ پر حملے ہیں "بازی" اس طرح لڑتی نہیں
"رخ نہیں" "پیلا" چلو اس گھر پہ کیا تکتے ہو تم
اور یہ گھوڑا جو ہے کمزور کیا تکتے ہو تم
آپ کو جچتی نہیں "اعراب" کی جھنجھٹ ..... مگر
رنگ لاتی ہے عموماً اس میں تحریفِ نظر

دوپہر سے شام ہو جائے کہ پچھلی رات ہو
ہل کے پانی بھی نہیں پیتے نہ جب تک مات ہو
ان کو الجھی چال سلجھانے سے زائد فکر کیا
"سب شہِ شطرنج ہیں" "سوئے سلف" کا ذکر کیا

دربشِ لہو و لعب ہیں صرف ہیں ہندی دماغ
داغ، ماتھے پر غلامی کے مگر دل باغ باغ

[1] گھر جانا [2] وزیر

Join eBooks Telegram

اختر الایمان

دعا

اب نہ شوریدہ سری ہے نہ امنگوں کا ہجوم
لب پہ فریاد نہ تھراتے ہیں پلکوں پہ نجوم
اب نہیں اٹھتا مرے سینے میں آہوں کا دھواں
اب نہیں پڑتا سرِ راہ کوئی ایسا مکاں
جس کی دیوار کے سائے میں سحر گاتی ہو
گوشے گوشے سے جہاں بوئے چمن آتی ہو
اب بھٹکتی نہیں نظریں کسی صورت کے لئے
اب نہیں رکتے کسی در پہ عبادت کے لئے
کوئی بیٹھا ہے پسِ پردہ نہیں ہوتا قیاس
میں بگونہ ہوں مجھے اب نہیں ہوتا احساس
میرے پہلو میں دھڑکتے ہوئے دل کا مفہوم
گردشِ خون ہے باقی ابھی ہر اک شئے معدوم

Join eBooks Telegram

میری وہ آنکھیں کبھی جن میں تڑپتا تھا شباب
جو رہا کرتی تھیں اک درد کے مارے بے خواب
آج اس واسطے چہرے پہ ہیں بینا کہلاؤں
آج اس واسطے بینا ہوں کہ سب دیکھتا جاؤں

تم نے میرے لئے جس دن کی دعا مانگی تھی
یہ وہی روز قیامت ہے مبارک ہو تمھیں

Join eBooks Telegram

خلیل الرحمٰن اعظمی

سوداگر

لو گجر بج گیا
صبح ہونے کو ہے
دن نکلتے ہی اب میں چلا جاؤں گا
اجنبی شاہراہوں پہ پھر
کاسۂ چشم لے لے کے ایک ایک چہرہ تکوں گا
دفتروں، کارخانوں میں، تعلیم گاہوں میں جا کر
اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا

میری آرام جاں!
مجھ کو اک بار پھر دیکھ لو
آج کی شام لوٹوں گا جب

Join eBooks Telegram

یہ پیچ کر اپنے شفاف دل کا لہو

اپنی جھولی میں چاندی کے ٹکڑے لئے

تم بھی مجھ کو نہ پہچان پائیں تو پھر

میں کہاں جاؤں گا

کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون تھا

کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون ہوں

Join eBooks Telegram

محمود ایاز

جلاوطن

سحر و شام نے سو رنگ سے کی جلوہ گری
میں نے ہر رنگ میں اک جلوۂ یکتا ڈھونڈھا
جس کی تصویر صنمخانۂ عالم میں نہیں!
میں نے ہر خواب میں وہ روئے دل آرا دیکھا
خواب کی دھند میں چلتا رہا منزل منزل
اپنی ہی آگ میں جلتا رہا تنہا تنہا
عمر بھر اپنی ہی تخئیل کے پیکر پوجے
رگِ احساس میں خود زہر کا نشتر رکھا
جس کے شعلوں میں جلی راحتِ عالم کی طناب
میں نے جاں دیکے اس اک آگ کو روشن رکھا
دل کی تسکین کے عنوان بہت تھے لیکن
میں نے اے حسنِ گریزاں! ترا دامن تھاما!!

Join eBooks Telegram

وحید اختر

کھنڈر آسیب اور پھول

یہ بھی طلسم ہوش ربا ہے
زندہ چلتے پھرتے ہنستے روتے نفرت اور محبت کرتے انساں
صرف ہیولے اور دھنوئیں کے مرغولے ہیں
ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنے توہم کے کاندھوں پر لادے سست قدم واماندہ
خاک بسر، داماں دریدہ، زخمی پیروں سے کانٹوں انگاروں پر چلتے رہتے ہیں
ہم سب ایک بڑے قبرستان کے آوارہ بھوت ہیں
جن کے جسم تو ہاتھ لگانے سے تحلیل خلا میں ہوں
جن کی روحوں کا ظاہر ہے نہ ظاہر گوشہ ہاتھ نہ آئے

یہ بھی طلسم ہوشں ربا ہے
ہم کو ماضی سے ورثے میں کہنہ قبریں، گرتے ملبے اور آسیب زدہ کھنڈروں کے ڈھیر ملے ہیں
وہ روشن شب تاب دیے جن سے ماضی کو نور ملا تھا
اس آسیب زدہ ماحول میں یوں چلتے ہیں
جیسے اک ہول بیاباں کے تیرہ سناٹے ہیں

Join eBooks Telegram

کچھ بھوتوں نے

راہ گم کردہ سیاحوں کو بھٹکانے کی خاطر آگ جلائی ہو

اب یہ اجالے صرف دھواں ہیں

اور آسیب زدہ کھنڈروں کی چھت کے چٹختے شہتیروں کے موڑ میں کوئی ہنستا ہے

جھڑتا چونا، گرتی مٹی، نیم معلق دیوار و در

پٹکے پچکے روتے ہیں

صحن کے صدہا سال پرانے بوڑھے پیڑ

قبروں کے بے درد مجاور بنجر لاشوں پر سوکھے پتوں کے ڈھیر لگا دیتے ہیں

یہ بھی طلسم ہوش ربا ہے

ہم سب اپنی اپنی لاشیں اپنے انا کے دوش پہ لادے

اک قبرستاں کی پرہول اداسی سے اکتائے ہوئے

اپنی قبریں چھوڑ کے بوسیدہ کفنوں ہی میں ملبوس

ایک نئے شمشان کا رستہ ڈھونڈ رہے ہیں

جہاں ہماری ایسی ہی کتنی لاشیں، لاشوں کے نگہبان

اپنی چتاؤں پر بیٹھے مرگِ انبوہ کے جشن میں چیخیں مار رہے ہیں

Join eBooks Telegram

بین میں بھی لذت ہے کرب میں بھی انجانی نفرت خیز مسرت ہے

منتظرِ مرگ انبوہ ہجوم آنکھوں کے خالی کاسے کھولے ہر شے دیکھ رہا ہے

جانے کب کوئی آئے گا

جو اپنے دامن کی ہوا سے آگ لگا کر

بھوتوں کا جلنا دیکھے گا

جانے کب کوئی آئے گا

جو اپنے دامن کی ہوا سے آگ لگا کر بھوتوں کا جلنا دیکھے گا

جلتا گوشت چٹختی ہڈی، ٹوٹتے سر، پانی کی طرح بہتے ہوئے مغز اور پگھلی چربی

اپنی چتا پر تیل چھڑک کر اس پر ہول الاؤ میں شعلوں کا ناچ دکھائیں گے

اور بھیانک سائے گلے مل مل کر کھوکھلی آوازوں میں روئیں گے

اس منظر میں جانے پھر کوئی آئے کہ نہ آئے

جو ویراں مایوس نگاہوں کی خالی جھولی پھیلائے

راکھ میں پھول کریدے گا!

Join eBooks Telegram

شفیق فاطمہ شعریٰ

اک ستارہ

اک ستارہ مری قسمت کی اندھیری شب میں
جگمگاتا ہے، نظر پڑتے ہی چھپ جاتا ہے
ٹوٹ جاتا ہے، مرے چھوتے ہی مثلِ شبنم
مسکراتا ہے جو انجان مجھے پاتا ہے
جانتی ہوں کہ یہ اک کھیل ہے لاحاصل کھیل
پھر بھی اس کھیل میں جینے کا مزا آتا ہے

مجھکو معلوم ہے آئینِ دمِ بادِ سحر
کہ کوئی کنج نہ محروم رہے خوشبو سے
کہ پہنچ جائے ہر اک برگ کو پروانۂ رقص
ہر کہیں سبزۂ نورستہ تلاطم سیکھے
کیا کروں پھر بھی تمنا پہ کوئی زور نہیں
کیا کروں دل میں جو ارمانوں کی مے جوش کرے

Join eBooks Telegram

چاہتی ہوں کہ کبھی چھوڑ کے تعمیم کا دشت
صرف میری ہی کُٹی میں ہو طلوعِ مہتاب
مجھکو معلوم ہے مقسومِ تمنا اپنا
جانتی ہوں کہ یہ اک خواب ہے ٹوٹا ہوا خواب
پھر بھی اس خواب کا بخشا ہوا، دیوانہ پن نئے
میرے نغمہ میں بہا آتا ہے بہاروں کی شراب

میری پلکوں میں نئے اشک پرو دیتا ہے۔
میری ہر شب کو سویرے سے ملانے کیلئے۔
ابن مریم کے نفس مجھ میں سمو دیتا ہے
جب اجڑتی ہوں تو آتا ہے بسانے کے لئے۔
کتنے ہنگامے مری روح میں بو دیتا ہے
غمِ نایابئ تعبیر بھلانے کے لئے

Join eBooks Telegram

شہریار

طلسم ٹوٹنے پر

برہنہ ہواؤں کو اپنا سمجھ کر
لہو روتے لمحوں سے دامن بچا کر
وفاؤں کی دنیا سے کچھ دور جا کر
مری آرزوئیں!
امیدوں کے چہرے سے پردہ اٹھا کر
دکھانے لگیں زخم سینے کے اپنے

سسکتے ہوئے اشک پلکوں سے گر کر
چمکتے ہوئے آبلوں سے لپٹ کر
مری سادگی پر بہت دیر روئے

Join eBooks Telegram

شہریار

دوستو

کوئی صورت ہو الزام کی دوستو
رو چکی بیکسی شام کی دوستو
بکھر چکی چاندنی بام کی دوستو

وعدہ و عہد و پیماں کچھ بھی نہیں
دل بہلنے کا ساماں کچھ بھی نہیں

چشم خونبار میں خواب اترے کوئی
آخر شب ہے مہتاب ابھرے کوئی

Join eBooks Telegram

طاہر رضوی

بازگشت

ماضی کی بستی سے کہیں
خوابوں کی اجلی راہ سے ہو
اک شہر شبِ تنہائی میں
مجبور اپنی چاہ سے
نمناک شمعیں تھام کر
آہ و بکا ـــ کرتے ہوئے
اک قافلے کے روپ میں
ماتم بپا کرتے ہوئے
اک آرزو کی لاش کو
یادوں کے ڈولے میں لئے
گزرے ہوئے لمحاتِ غم
آتے ہیں ملنے کے لئے

Join eBooks Telegram

من موہن تلخ

سالگرہ

قصۂ ہجرِ حیاتِ غمگیں!
درد سے کہہ دو نہیں آج نہیں
آج کی شام ہے وہ شامِ الم
حادثہ گزرا تھا جب الفت پر
دلِ پر خوں سے کہو، ہو آئے
انہیں راہوں پہ جہاں کچھ غم کی
آج بھی بکھری پڑی ہیں یادیں
آج ہر داغ ہے انداز دگر
اس طرح سینے میں لو دے اٹھے
جس سے یہ درد عبادت بن جائے
یہ جو ترسی ہوئی ویراں آنکھیں
بن بہے آنسوؤں سے جلتی ہیں
آج کی رات فقط آج کی رات
ان میں ان چھلکی ہوئی آنکھوں کی
کوئی تصویر نہ ابھرے کہ کہیں
دل کا آئینۂ غم ٹوٹ نہ جائے
دامنِ ضبطِ فغاں چھوٹ نہ جائے

دل کو دکھنا ہے تو دھیمے سے دکھے
اسکی یادوں کو بھی آنا ہے اگر
یوں سما جائیں ہر اک دھڑکن میں
کوئی سسکی، کوئی آواز نہ ہو
غم کا ایسا کوئی انداز نہ ہو
شورِ فریاد و فغاں ہو جس میں
سوزِ تنہائی سے چپکے سے کہو
ایسی کچھ بات نہ ہونے پائے
جس سے غم پر کوئی حرف آجائے
آج اس درد کی ہے سالگرہ
جس کی ہر رسم بہت بھاری ہے
رت جگا آج منانا ہوگا
دردِ دل بھینٹ چڑھانا ہوگا

Join eBooks Telegram

فغانِ نیم شبی

من موہن تلخ

ب کا اک نوحۂ جواں مرگی
ف شب تک طلوعِ ماہ سے قبل
ں بادل سے محوِ سرگوشی
دکھی جان! اپنا روگتا

رہی تھی کوئی بساطِ درد
ٹ گیا دل بہ احتیاطِ درد
دبی سی فغانِ نیم شبی
سرتِ مرگ کی فغاں طلبی
بھلی اور کیا بری یادیں
و گئی ختم قدرتِ تنظیم
ے نگاہوں میں انتشارِ عظیم
ک کیفیتِ نشاط و الم
ج کی شب سے کچھ بعید نہیں
ے رہ رہ کے دل میں یادوں کی
شام سے اڑ رہی ہے گرد ہی گرد.

نیند اب اڑ گئی فضاؤں میں
ماہِ نو شب کا دیدۂ بے خواب
موت کی طرح کیوں ہے زرد اور سرد
سو گئی رات، جاگتا ہے درد

دل کی ہر ڈوبتی سی دھڑکن میں
عمر بھر کے دکھوں کا آج ہے ہاتھ
کہہ رہے ہیں کہ غم کو لے کے ساتھ

دلِ پُر خوں میں ضبط ڈھونڈیں گے
دل کی ہر دکھتی رگ ٹٹولیں گے
اور اگر مل گئی کوئی بھی کڑی
ہر گرہ سوز و غم کی کھولیں گے
ہر گرہ پہ ذرا سا رو لیں گے
شب کا یہ نغمۂ جواں مرگی
اپنی آواز میں سمو لیں گے.

Join eBooks Telegram

کرشن موہن

ناچ

سنگیت کی مادک لہروں پر
چنچل ناگن لہراتی ہے
وہ جسم کی ہر اک جنبش سے
کومل مدرا چھلکاتی ہے

مستی کی قسمیں کھا کر
اس کی چنچلتا گاتی ہے
جوبن اک رمتا جوگی ہے
کیوں اپنا من بھرماتی ہے

وہ جانتی ہے یہ بھید مگر
جوبن سے آنکھ ملاتی ہے
چت چور البیلی رقاصہ
مسکان میں ڈھلتی جاتی ہے

ہر پرانی کے من مندر میں
آشا کی جوت جگاتی ہے

Join eBooks Telegram

کرشن موہن

روپ

شوخ و دلنواز رنگِ پیرہن
پیرہن کہ گلفشاں ہے اک چمن
آنچ دے رہا ہے میرے دل کو بھی
دیپ راگ تیرا آتشیں بدن،
مہرِ شرق تاب تیلا جیرتی!
چاند پر ترا نکھار طعنہ زن
موج مے ہے جنبشِ بدن کی لے
اسکی لہر انکھڑیوں کا بانکپن
تیری مانگ کا یہ چمپئی سہاگ
مانگتی ہے جس سے کہکشاں پھبن
تیرے رخ میں اپنا عکس دیکھکر
تمتما اٹھا ہے عارضِ سخن

Join eBooks Telegram

قطعات

تکملۂ فن

کسی تعمیر کی تکمیل کے بعد
کاٹ لیتے تھے جو معمار کے ہاتھ
اب وہ سفاک نہیں ہیں ورنہ
رہ نہ پاتے کسی فنکار کے ہاتھ

ہر نقطہ مقامے دارد

بندی ہو کہ خال ہو کہ "مصنوعی تل"
"مصرفِ تیرگی" اگر آتا ہے
"روئے شاداب" مہ جبیں پر اے دوست
ایک نقطہ بھی لطف دے جاتا ہے

Join eBooks Telegram

ساونی

وہ چُندری اوڑھ کر جب آ بسے ہوں گے
فضا مہکی تو بادل چھائے ہونگے
جو پینگوں میں "ڈھلا ہو گا دوپٹہ"
تو ہم ان کو بہت یاد آئے ہونگے

حق الیقین

پھولوں کے چہرے اترے ہیں کلیاں نکہت سے خالی ہیں
کس کافر کو اس میں شک ہے آپ گلستاں کے مالی ہیں
آپ گلستاں کے مالی لیکن یہ بھی ملحوظ رکھیں
رنگت سے خالی کلیاں بھی رخصت ہونے والی ہیں

حلقۂ بیرونِ در

اسکی محفل میں شکووں کا عادی کوئی کان نہیں
ہر فریادی چھوڑ رہا ہے تیر غلط انداز کے پر
اُس بت سے ماحول کی الجھن کہنے سے کیا حاصل شاد
احمق ہی آوازیں دیگا قفل پڑے دروازے پر

Join eBooks Telegram

مصنف ــــــــــــ منظور حسین شور

صفحات ــــــــــــ ۳۵۲

قیمت ــــــــــــ چھ روپے

ناشر ــــــــــــ مکتبہ افکار، رابسن روڈ کراچی

منظور حسین شور کا کلام عرصۂ دراز سے مختلف رسائل میں چھپ رہا ہے "نبضِ دوراں" ان کا پہلا شـ
مجموعہ ہے، مجموعے میں مصنف کا خود نوشت دیباچہ بھی شامل ہے۔ اس دیباچے سے پڑھنے والا ان کی
شاعری کے بارے میں جو اونچی توقعات قائم کر لیتا ہے وہ کلام کے مطالعہ کے بعد بری طرح مجروح ہوتی
ہمارے عہد کے تقریباً سبھی شاعروں کی طرح شور بھی موجودہ سیاسی، معاشی اور اخلاقی نظام
غیر مطمئن ہیں اور ایک بہتر نظامِ حیات کے متمنی ہیں ممکن ہے کبھی زمانہ میں اردو شاعری میں حال سے
اور ایک بہتر مستقبل کی تمنا کا اظہار کسی کے صاحبِ فکر و فن ہونے کی دلیل رہا ہو لیکن اب نا آسودگی اور بـ
کا یہ اظہار بے حد عام اور فرسودہ ہو چلا ہے، اسی لئے میں نے زیرِ نظر مجموعے میں صرف یہ دیکھنے کی کو
ہے کہ موضوعات سے قطع نظر کم از کم احساس و اظہار کی سطح پر شاعر نے کس حد تک اپنی انفرادی
اور شخصیت کے نشان چھوڑے ہیں مجھے افسوس ہے اس نقطۂ نظر سے بھی اس مجموعے کا مطالعہ حوصـ
ـــ نتائج کا حامل نہیں ہے

شور نے بے حد تنوع پسندی سے کام لیتے ہوئے دنیا جہاں کے موضوعات پر شاعری کی ـ

Join eBooks Telegram

ن ان کی یا ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہر نظم میں خواہ وہ کسی موضوع پر ہو، ایک ہی اکتا دینے
بے رنگی کو کامیابی سے برقرار رکھتے ہیں۔ ان نظموں کو پڑھتے ہوئے آپ کو جوش یاد آسکتے ہیں، مجاز
اختر شیرانی یاد آسکتے ہیں اور کہیں کہیں اقبال کی مسخ شدہ آواز بھی سنائی دے گی لیکن اگر اس مجموعے
سی آواز کا مکمل فقدان ملتا ہے تو وہ خود صاحب کلام کی آواز کا ہے ویسے شورش نے اپنی بساط بھر تو پوری
ش کی ہے کہ وہ اپنا ایک خاص لب و لہجہ اور منفرد آواز پیدا کرسکیں لیکن ان سے بس اتنی فرو گزاشت ہوگئی
نظموں نے یہ انفرادیت احساس فکر اور تجربے کی سطح پر پیدا کرنے کی بجائے چند مخصوص الفاظ کے جا و بیجا
مال اور تکرار میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے

مجھے اس بات پر اعتراض نہیں ہے کہ شورش جوش، مجاز، اختر شیرانی اور اقبال سے کیوں متاثر ہیں اور یہ
بات ہے کہ جوش، مجاز اور اختر شیرانی سے فکری طور پر متاثر ہونا صرف ایک اوسط درجے کے ذہن کے
ہی ممکن ہے لیکن جو نظمیں وہ اپنے نام سے پیش کرتے ہیں ان میں کم از کم لب و لہجے کی حد تک کوئی
ادیت پیدا کر لیتے تو بڑی بات تھی۔ اس کی بجائے اس مجموعے کی نظمیں پڑھتے ہوئے کہیں اختر شیرانی اور مجاز
عو کا ہوتا ہے (احساس اور انداز بیان) اور کہیں اقبال (اخلاق کائنات سے اور استبداد ور) کا عکس
ر آتا ہے تو فطری طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ہمیں جوش، اختر شیرانی، مجاز اور اقبال کے تاثرات اور
س بیان سے مستفید اور محظوظ ہونا ہے تو پھر شورش صاحب کو کیوں زحمت دی جائے

ہمارے یہاں انقلاب کے نام پر کوئی شاعری کی گئی ہے اور حصول آزادی سے پہلے کا ہندستان جس خاص
سے گزر رہا تھا اس عہد میں اس قسم کی انقلابی شاعری کی مقبولیت تعجب خیز نہیں تھی لیکن جوش کی
بعد میں اسی انقلابی لہجے کو برقرار رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے شاعر ذہنی ارتقا کو بھی خطرناک
سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ لفظ انقلاب کی مسلسل تکرار اور "لے میرو"، "وحشی کمینے بدگماں" کے بغیر اپنے
فی الضمیر کے اظہار کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ شورش کی تقریباً سبھی نظمیں الفاظ و تراکیب کی شان و شوکت
باوجود دوسرے درجے کی شاعری کا نمونہ پیش کرتی ہیں

اس مجموعے میں چند ایک الفاظ کی اس طرح بار بار تکرار ہوئی ہے کہ یہ الفاظ اس مجموعے کا
PATENT DICTION معلوم ہوتے ہیں، جیسے "رسول"، "مناجات"، "محراب و منبر"، "زہر و
یخ"، "آتش و خون"، "دھواں اور آگ" وغیرہ وغیرہ۔ الفاظ کے غیر شاعرانہ استعمال کی ایک نمایاں

Join eBooks Telegram

مثال اس مجموعے کی ایک ،، نظم ،، سانپ ہے جو اس مجموعے کی کمزور ترین نظم ہے۔ احسان دانش نے کئی سال پیشتر ایک نظم ،، باغی کا خواب ،، لکھی تھی جس میں ہر مصرع میں کئی کئی بار لفظ خون استعمال کیا گیا تھا (سپنوں میں خون، کلیاؤں میں خون، محلوں میں خون) شعور نے اپنی نظم ،، سانپ ،، میں اسی طرح سانپ اور اژدھوں کی تمام اقسام سے پڑھنے والوں کو متعارف کرایا ہے۔ چند ایک اشعار سے آپ بھی لطف اٹھایئے فرماتے ہیں

،، محلوں میں اژدھے رستوں میں بازاروں میں سانپ ۔ ساحلوں پر سانپ ہیں، طوفان کے دھاروں میں سانپ

،، کتنے قومی اژدھے ہیں کتنے دینی سانپ ہیں ۔ ہم نشیں نظروں میں کتنے آستینی سانپ ہیں

معبدوں میں اینٹھتے ہیں کتنے ڈسنے والے ناگ ۔ مندروں پر لوٹتے رہتے کتنے کالے ناگ

طوف کعبہ کرنے والے سانپ شب بیدار سانپ ۔ آہی جاتے ہیں نظر ہر گام پر دو چار سانپ

دوزخی کتنے سنپولے کتنے ناجی سانپ ہیں ۔ کتنے زائر اژدھے ہیں، کتنے حاجی ناگ ہیں

اس قسم کی چیزوں کو شاعری سمجھ کر مجموعے میں شامل کرنے کے لئے بڑی جرأت درکار ہے

شعور کی ایک اور کمزوری بحروں کا انتخاب ہے۔ شاعری میں مختلف جذبات کے اظہار کیلئے مختلف اور موزوں بحروں کا انتخاب ضروری ہوتا ہے کسی غمگیں اور خوابناک کیفیت کے اظہار کے لئے ،، بڑھے چلو بڑھے چلو ،، والی بحر موزوں نہیں ہوتی، مثلاً نظم ملاقات کیلئے جو بحر استعمال کی گئی ہے وہ بحر نظم کے مرکزی خیال اور کیفیت سے قطعاً میل نہیں کھاتی

،، حریم ناز ،، ،، خدائے محبت کے حضور ،، ،، ساقی ،، ،، یہ شاعر اور مشاعرے ،، ،، کلیسا ،، اور ،، جشن عید ،، اس مجموعے کی اچھی نظمیں ہیں۔ شعور نے جہاں کہیں بھی نظم کیلئے چھوٹی بحر استعمال کی ہے وہاں نسبتاً زیادہ شعریت اور تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ ،، یہ شاعر اور مشاعرے ،، ،، جشن عید ،، اور ،، ڈوبتے ستارے ،، سلاست روانی اور سادگی کے اعتبار سے کامیاب نظمیں ہیں۔ ،، یہ شاعر اور مشاعرے ،، میں طنز اور مزاح کے امتزاج سے انھوں نے ہمارے شاعروں اور مشاعروں کی عکاسی خوبصورتی کے ساتھ کی ہے۔ الفاظ پر ان کو قدرت حاصل ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھاتے۔ شاعری کیلئے جس دھیمے اور سلگتے ہوئے موثر لہجے کی ضرورت ہے ان کے یہاں اس کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ کا عظیم سرمایہ بھی ان کی اعانت نہیں کر سکتا

سرو و ناہید ۔ کے عنوان سے چند غزلیں آخر میں شامل ہیں۔ بیشتر غزلوں میں نظم کا بیانیہ انداز ملتا ہے

Join eBooks Telegram

جس سے غزلوں میں تغزل نہیں پیدا ہو سکا ہے، ویسے کہیں کہیں دو چار اچھے اشعار بھی مل جاتے ہیں
مکتبۂ افکار نے کتاب نہایت ہی اہتمام اور خوبصورتی کے ساتھ شائع کی ہے لیکن ضخامت کی مناسبت
سے کتاب کی قیمت کچھ کم ہونی چاہیے تھی۔

"تہذیب و تحریر"

مصنف: مجتبیٰ حسین - ناشر: مکتبۂ افکار، رابسن روڈ کراچی۔ ضخامت ۲۱۲ صفحات
کتابت طباعت: نفیس، مجلد خوبصورت گرد پوش قیمت پانچ روپے

چودہ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ چار حصوں میں منقسم ہے پہلے اور دوسرے حصے میں ادبی مسائل اور ادبی اقدار پر نظریاتی گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں غزل اور تغزل پر چار مضامین ہیں آخری حصے میں اکبر، حسرت، آرزو، فانی، اور ظریف کی شاعری اور شخصیتوں کے جائزے ہیں

اس مجموعے کی جو چیز مجھے زیادہ پسند آئی وہ مصنف کا لب و لہجہ اور انداز بیان ہے۔ انکی آواز میں خود اعتمادی ہے لیکن جارحانہ پن نہیں ہے۔ ان تحریروں میں مطالعہ کی وسعت اور فکر و بصیرت کا ثبوت ملتا ہے لیکن اس ثبوت کی فراہمی کیلئے دوسروں کی نالائقی کے اظہار کو ذریعہ نہیں بنایا گیا ہے ان مضامین میں ایک تربیت یافتہ اور منظم (DISCIPLINED) ذہن کا پتہ ملتا ہے، اہم اور فکر انگیز موضوعات پر سنجیدگی سے اظہار خیال کرتے ہوئے بھی زبان و بیان کی ادبیت کو برقرار رکھا گیا ہے لیکن یہ ادبیت ایسی ادبیت بھی نہیں ہے جو بدقسمتی سے اردو کے اکثر و بیشتر نقادوں کے ہاں افراط سے ملتی ہے۔ تنقید میں جاندار اور ادبی نثر لکھنے کے ساتھ ہی الفاظ کے استعمال اور قطعیت اور PRECISION کو ملحوظ رکھنے والے نقاد ہمارے ہاں بہت کم ہیں، اتنے کم کہ احتشام حسین، محمد حسن اور مجتبیٰ حسین کے علاوہ شاید زیادہ سے زیادہ دو چار اور ہوں تو ہوں

اس کتاب میں ادب اور ادبی مسائل پر ہمارے دور کی فکری، سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کی نسبت سے انکی غور و فکر سے جن نتائج کا استنباط ہوا ہے ان سے مکمل اتفاق ضروری نہیں لیکن اس غور و فکر کے خلوص یا استحقاق سے انکار ناممکن ہے یوں تو اس جمہوری دور میں کسی بھی امر کا استحقاق کوئی خاص بات نہیں

Join eBooks Telegram

رہا ہے، لیکن میں نے یہاں اس لفظ کا استعمال ان مضمون میں کیا ہے کہ ملی، ادبی مسائل پر ذمہ دارانہ گفتگو کرنے کیلئے جس علم و تفکر اور بصیرت و آگہی کی ضرورت ہوتی ہے، مجتبیٰ حسین اس سے محروم نہیں ہیں۔

اس مجموعے کے تمام مضامین (سوائے آخری دو مضامین کے) بڑی دلسوزی اور محنت سے لکھے گئے ہیں اور سنجیدگی کے ساتھ پڑھے جانے کے مستحق ہیں لیکن پہلے دو حصوں کے مضامین بطور خاص غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور اس حصہ کا ایک مضمون "ادب اور اعتبار" تو ایسا ہے کہ ہر اچھے ادبی رسالہ میں اسے نقل ہونا چاہیئے، اس مضمون کا مطالعہ نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کیلئے بلکہ ادب کا ذوق رکھنے والے ہر فرد کیلئے ضروری ہے

اردو میں اچھے تنقیدی مضامین ہمیشہ کمیاب رہے ہیں لیکن گزشتہ آٹھ دس برس میں یہ کمیابی نایابی میں تبدیل ہوگئی ہے، ان حالات میں اتنے اچھے تنقیدی مجموعے کی اشاعت پر اردو دانوں کو مجتبیٰ حسین اور مکتبۂ افکار دونوں کا ممنون ہونا چاہیئے

دو شخصیات و واقعات

جنھوں نے مجھے متاثر کیا

مرتب: جنید احمد۔ ملنے کا پتہ: جنید احمد صاحب معرفت پوسٹ ماسٹر ٹونک۔ قیمت پانچ روپے مع محصول ڈاک

اردو میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، اردو کے بارہ مشہور ادیبوں نے اس کتاب میں حصہ لیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان کی افتاد طبع کو متاثر کرنے اور فکر و ذہن کی ساخت کو متعین کرنے میں کن کن عوامل کا ہاتھ رہا ہے یہ کتاب اپنے اندر عوام اور خواص دونوں کیلئے دلچسپی کا سامان رکھتی ہے، دوسروں کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننے کی فطری خواہش رکھنے والوں کے علاوہ ایسے لوگوں کیلئے بھی کتاب فکر انگیز ثابت ہو سکتی ہے جو انسانی فطرت اور ماحول کے تعلق کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں۔

Join eBooks Telegram

جنید صاحب نے اپنے طور پر جان توڑ کوشش کی ہے لیکن لکھنے والوں نے ان کے ساتھ خاطر خواہ تعاون
نہیں کیا ہے، جن لوگوں نے کتاب کیلئے سرے سے مضامین لکھے ہی نہیں ان سے مجھے اتنی زیادہ شکایت نہیں ہے،
جتنی ان لوگوں سے جنھوں نے خلوص کے ساتھ اس موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی ورنہ یہ
کتاب اور زیادہ کامیاب ہوتی، اکثر مضامین میں وہ والہانہ پن اور بے ساختگی نہیں ملتی جو اس نوعیت کے
مضامین کی جان ہوتی ہے، کچھ لوگوں نے واقعات کو کھینچ تان کر اپنے عقائد کا جواز تلاش کرنے کی کوشش
کی ہے تو کچھ حضرات بیحد SELF-CONSCIOUS ہو گئے ہیں۔ اس مجموعے میں ڈاکٹر اشرف
کا مضمون تشنہ ہونے کے باوجود دوسرے سارے مضامین سے بہتر ہے۔ اس مضمون کے علاوہ سجاد ظہیر، جعفری
اور عصمت کے مضامین بھی اچھے ہیں، سرور نے کافی بے تکلف انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ
کوشش بذات خود اتنی ABJURED ہے کہ ہر قدم پر ضبط، رکاوٹ اور تصنع کاری کا احساس ہوتا ہے
نیاز صاحب کا مضمون انکی کجرو شخصیت کی تعمیر کرنے والے عوامل کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے، "کجرو" کا لفظ
میں اس لئے نہیں استعمال کر رہا ہوں کہ انھوں نے مذہب یا اخلاق کے بارے میں عام عقائد سے ہٹے
ہوئے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ میرا اشارہ انکی نرگسیت کی طرف ہے جو اس پختہ سالی میں بھی ان سے
وہی طفلانہ حرکتیں کرا رہی ہے، بدقسمتی سے آسکر وائلڈ نیاز صاحب کے اعصاب پر اس طرح اثر انداز ہوا
ہے کہ وہ عمر بھر اسکے چنگل سے نکل نہیں سکے۔ شاید نیاز صاحب کو ابتک یہ پتہ نہیں چلا کہ بیچارا آسکر وائلڈ خود
بہت چھوٹا آدمی اور ادیب تھا۔ دراصل وہ آسکر وائلڈ ہوں یا نیاز صاحب، ان لوگوں نے "ادیب
کی انا" کو سمجھنے میں غلطی کی، بڑے ادیب کی انا یقیناً بڑی ہوتی ہوگی، لیکن ان معنوں میں نہیں جن معنوں
میں نیاز صاحب نے سمجھ رکھا ہے، آسکر وائلڈ نے تو خیر اپنے آخری دنوں میں اس بڑی انا کی حقیقت کو پا لیا
تھا لیکن نیاز صاحب جانتے بوجھتے آج بھی اپنے آپ کو ایک MYTH میں تبدیل کرنے کی کوشش میں
مصروف ہیں۔ ہم لوگ اپنے کالج کے زمانے میں بیحد خلوص کے ساتھ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے کاش فلاں
محترمہ ہماری شاعری پر کالج میگزین میں کبھی ایک مضمون لکھ دیں، اب سوچتے ہیں تو ہنسی آتی ہے
لیکن اس سے زیادہ ہنسی اس بات پر آتی ہے کہ نیاز صاحب اب بھی اسی چکر میں پھنسے ہوئے ہیں
مجموعے میں ایک مضمون محترمہ سلمیٰ صدیقی کا بھی شامل ہے اور اسکی وجہ سمجھ میں نہیں آئی، کسی کی
خوشنودی اگر مقصود تھی تو الگ بات ہے، ورنہ مولانا عبدالماجد، نیاز فتحپوری، اعجاز، ظہیر، جعفری، عصمت

Join eBooks Telegram

کرشن چندر، سرور، عباس وغیرہ کے ساتھ ان کی شمولیت بے معنی تھی

یہ کتاب اردو میں سرآغاز کی حیثیت رکھتی ہے، اس سلسلے کو جاری رکھا جا سکے تو ہمارے ادب میں یقیناً ایک نیا اضافہ ہوگا ۔ جنید احمد صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی جانفشانی سے یہ مجموعہ مرتب کیا اور اسکی اشاعت کی، یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھے لکھے آدمی کی نظر سے ایک بار ضرور گزرے ۔

تفصیلات متعلقہ فارم ۴ تحت دفعہ ۸
پریس اینڈ رجسٹریشن ایکٹ

مقام اشاعت	۲۷ کلائن روڈ بنگلور ۵
مدت اشاعت	سہ ماہی
نام پبلشر، ایڈیٹر، مالک	محمود ایاز
قومیت	ہندستانی
پتہ	۲۷ کلائن روڈ بنگلور ۵
طابع	پاسبان پریس
پتہ	میناکشی کوئل اسٹریٹ بنگلور ۱

میں محمود ایاز تصدیق کرتا ہوں کہ اوپر درج شدہ معلومات میرے علم و یقین میں صحیح ہیں

محمود ایاز فروری سنہ ۶۰ء

ذرے

پاؤں کی خاک ہیں یہی ذرے
یہی ذرے ہیں ماہ و انجم تک

فضا کوثری کے حسین و جمیل قطعات کا مجموعہ

(زیر طبع)

Join eBooks Telegram

سوغات کا معیار نہایت حوصلہ افزا ہے، خوشی کی بات یہ ہے کہ اس میں معاصرانہ ادب کے بارے میں جو بحث چل رہی ہے اس کا انداز بڑا توانا اور صحت مند ہے، پروفیسر محمد حسن صاحب کے مضامین "سوغات" کی سوغات خاص ہیں

البتہ ایک بات کھٹکتی ہے پاکستانی (اردو کے) نقاد ہندستان میں اردو تخلیقات سے پوری طرح باخبر نہیں ہوتے مگر ادیبوں اور شاعروں کے جائزے میں کچھ ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جیسے جو چیز ان تک نہیں پہونچ سکی وہ فنی تخلیق میں شامل ہی نہیں یہی حال ہندستانی (اردو کے) نقادوں کا ہے کہ انھیں پاکستان میں ادب کی تخلیق کی رفتار کا کما حقہ علم نہیں ہے مگر وہ اپنے جائزوں میں اپنی اس مجبوری کا کوئی ذکر نہیں کرتے اور ہم پاکستانیوں کی جو ایک آدھ چیز پڑھ لیتے ہیں اسی پر اپنے برسوں کے جائزے کی بنیاد رکھ دیتے ہیں، یہ بے انصافی ہے

احمد ندیم قاسمی

سوغات کا تازہ شمارہ مل گیا، پرچہ ابھی زیر مطالعہ ہے پڑھکر مفصل رائے سے آگاہ کروں گا، مگر یہ تو ظاہر ہے کہ سوغات کا ادبی معیار ہندستان کے دوسرے تمام اس قسم کے رسائل سے بلند ہے۔ یہ کامیابی قابل رشک ہے اور لائق صد ستائش ہے، مگر اس پر تکیہ کرکے بیٹھ جانا اچھا نہیں ہوگا۔ پرچہ کیلئے اچھا کاغذ حاصل کیجئے، دیگر فنون لطیفہ پر بھی مضمون حاصل کیجئے، آجکل کے ادیبوں کو میری دانست میں سائنس، مصوری، بت تراشی، فن تعمیر، موسیقی اور جدید سیاسی اور معاشی تحریکوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنا چاہئے

Join eBooks Telegram

ادب پہلے بھی کوئی مجرد شئے نہ تھا اور اب تو وہ ایک بے حد پیچیدہ ذہنی عمل بنتا چلا جا رہا ہے
تازہ شمارے میں علی جواد زیدی کا مضمون بہت عمدہ ہے، گو مجھے ڈاکٹر محمد حسن اور علی جواد زیدی
دونوں ہی سے کئی امور میں اختلاف محسوس ہوتا ہے مگر بحث کا رخ متوازن اور سنجیدہ فکر کا حامل ہے
ان دنوں یہ انداز تخاطب کسی قدر غنیمت معلوم ہوتا ہے!!

کرشن چندر

سوغات کا بیشتر حصہ پڑھ لیا ہے، کچھ رہ گیا ہے مجھے محمد حسن کا مضمون اچھا لگا. باقر مہدی نے ایک سوال کے نام سے اتنے سوال کئے ہیں کہ بات الجھ گئی ہے، یہ نئی نسل جس کا ذکر اکثر رسائل اور ادبی مضامین میں دیکھتا ہوں کونسی ہے، میری ملاقات ابھی اس سے نہیں ہوئی!!

اختر الایمان

سوغات کا تیسرا شمارہ مل گیا، اسے آپنے بہت انتظار کرایا، لیکن پرچہ بہت اچھا نکلا ہے، باقر مہدی کا مضمون سرسری ہے لیکن متوازن ہے، علی جواد زیدی کا مضمون بہت اچھا ہے، انھوں نے پچھلے ۲۵ سال کے رجحانات کے بعض اہم اور نازک پہلوؤں کے متعلق بعض ایسی ضروری باتیں لکھی ہیں جن سے عام طور پر لوگ کترا کے نکل جاتے ہیں، ان کے اگلے مضمون کا بھی مجھے انتظار ہے، اختر الایمان پر آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا

خلیل الرحمن اعظمی

آپ کے اداریے کے پہلے ہی جملے سے مجھے اختلاف ہے، میں ادب میں جمود کا کبھی قائل نہیں تھا اور نہ ہوں اگر انقلابی مباحث نہ ہوں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ "سکوت" یا "ذہنی کاہلی" کا دور دورہ ہے (یہ الگ بات کہ ہندستان کی ایک صدی کی تاریخ میں جو چند مفکر اور دانشور گزرے ہیں وہ کسی قسم کی "کاہلی" میں ضرور مبتلا رہے ہیں، جیسے، ابوالکلام آزاد، بہرحال دوسرے دانشور جیسے ادیو یکانند کملا سوامی ٹیگور یہ یقینی طور پر علمی پایہ کے دانشور تھے)

Join eBooks Telegram

ARTHER ABENON کا ایک ہی ڈرامہ جو انگریزی میں شائع ہوا ہے (PING PONG)
اس کو پڑھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ نئی نسل کے افراد خواہ وہ فرانس میں ہوں کہ انگلستان میں
YOUNG ANGRY MEN ہوں یا امریکہ میں BEAT GENERATION کے زیر ہوں
ایک بات ان سب میں مشترک ہے کہ وہ دنیا کے مختلف فلسفوں اور نظریات کی کھوکھلی ثابت جا نچ
رکھتے ہیں اور ذہن میں کسی ایک سے وابستہ نہیں ہیں، ممکن ہے کہ تک یہ بات اعتراض کے طور پر
کہی جاتی رہی ہو مگر آج یہ بات ایک خوبی یا خصوصیت کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ اس لئے آپ کا یہ اعتراض
کہ آزادی کسی نہ کسی منزل، یا مقصد کیلئے ہونی ضروری ہے، کچھ زیادہ صحیح نہیں۔ اسی موضوع پر کسی نے
ایک شعر کہا ہے ؎

منزل کی جستجو کا اگر راز کھل گیا   ہوگا وہی سوال کیسے رہنما کریں

کیا یہ منزل نہیں ہے کہ ہم صداقت کے جویا ہیں اور ہر قیمت پر ادبی اقدار، جس میں زندگی
کے اعلیٰ اقدار بھی شامل کی جا سکتی ہیں، کی نئی تشکیل کرنے کیلئے فکر مند ہیں؟
آپ نے "عام آدمی" اور "فنکار" کیلئے آزادی کو الگ الگ کیا ہے مگر وہ لوگ جو آپ کے ہمنوا ہو سکتے
ہیں وہ یہاں آپ سے شدید اختلاف کریں گے، گو کہ میں اس نکتہ پر مشروط اتفاق کروں گا، میری شرط
صرف یہ ہے کہ فنکار کی آزادی اسے بعض ایسے تجربے کرنے پر "مجبور" (مجبور ان معنوں میں کہ وہ
اپنی INNER CALLING سے مجبور ہو جاتا ہے) کرتی ہے جو بظاہر غیر سماجی معلوم ہوں گے۔
جیسے کہ چین اور ہندستان میں اگر تصادم ہو جائے تو میں ہرگز اس میں کسی قسم کا حصہ نہ لوں گا
اور اردو شاعر کا یہ جملہ دہراؤں گا کہ "رہنماؤں نے حب الوطنی کے نام پر بے شمار فنکاروں کو جنگ کی
آگ میں جھونک دیا ہے" تو بظاہر میرا یہ فعل کہیں "قومی جنگ" (یہ تو می جنگ اس لئے بن سکتی ہے
کہ سیاسی جماعتیں اپنے مفاد کیلئے اس کو یہ نام دینگی) میں حصہ نہیں لوں گا۔ مجھے "غیر سماجی"
بناتا ہے، مگر حقیقت میں یہ راز فاش کرتا ہے، سیاستدانوں نے ملک اور قوم کے دانشوروں کو اپنے ماتحت
کر کے ادبی اقدار کو سرے سے نظر انداز کر دیا ہے اور وہ "مفکرین" اور ادیبوں کو اپنے نظام میں کلرکوں سے
زیادہ اہمیت نہیں دے رہے ہیں، تو جناب نئی نسل کے ادیب اگر اس رویہ کی کھلم کھلا مخالفت کر رہے ہیں
تو کونسی "غیر ذمہ دارانہ حرکت" کر رہے ہیں؟

Join eBooks Telegram

آپ کا یہ خیال غلط ہے (میرے خیال میں) کہ نئی نسل پراگندگی فکر اور آزادی فکر کا فرق نہیں جانتی، آپ نے کوئی مثال بھی نہیں دی ہے، اگر وہ نہ جانتی ہوتی تو یہ سوال ہی کیوں اٹھاتی کیونکہ یہ سوال تو دو دھاری تلوار ہے جو غلط استعمال کرنے والے کو خود ہی ہلاک کر دیتی ہے اور جہاں تک صحیح اور غلط مصرف کا سوال ہے تو اس کا کیا پیمانہ ہے؟ کیا وہ "افادی ادب" جو ابھی چند برسوں تک "روشنی طبع" بنا ہوا تھا وہ صحیح تھا یا غلط؟ ادب میں اس طرح غلط اور صحیح کا استعمال ہی بیجا ہے آج کوئی شئے بڑی حد تک مکمل غلط اور مکمل صحیح نہیں رہ گئی ہے۔

اب اسی بات "فکر کی گہرائی" اور مطالعہ کی تو اس کے بارے میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ آج کی تعلیم زندگی اور ادب دونوں کا بڑی حد تک نا کارہ شعور دیتی ہے۔ ادیب کو ہر دور میں اپنی تعلیم کرنی پڑتی ہے اور یہ مسئلہ بھی نیا نہیں ہے

ہاں مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ کتنی ہی بار "شہاب ثاقب" چمکے اور ہم نے امیدیں لگائیں مگر وہ پوری نہ ہو سکیں، آپ کا یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ کم عمری میں تھوڑی سی مشق کے بعد چند غنیمت چیزیں لکھی جا سکتی ہیں، مگر بھائی یہ تو ہر دور میں ادب اور ادیبوں کیلئے صحیح ہے، اس لئے پھر وہی بات آتی ہے کہ ہر ادیب کو اپنی تعلیم اور شخصیت کو پروان چڑھانا ہوتا ہے، یہ مسئلہ تو اچھے ادب کی ابتدا سے ہے

ذرا یہ دیکھئے یہ دور کتنا جان لیوا ہے ایک طرف ہندستان میں زندہ رہنے کیلئے بڑی سخت جد وجہد کرنی پڑتی ہے، قدم قدم پر دام فریب ہیں، فلم تجارت، ملازمت یا کوئی بھی پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے (اور وہ بھی کتنوں کو ملتا ہے؟) دوسری طرف تجربے اور علم حاصل کرنے کیلئے ہر لمحہ خارزار کا سامنا ہے نئی نسل کا ادیب پل صراط سے گزر رہا ہے پھر آپ اسکی اتنی مذمت کرتے ہیں

باقر مہدی

تازہ شمارے میں اختر الایمان پر آپ کا تبصرہ بہت ہی جامع اور فکر انگیز ہے۔ جہاں تک تبصرے کا تعلق ہے بس آپ کے خیالات سے بڑی حد تک متفق ہوں کیونکہ میں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ ادب کا جدید مزاج اختر الایمان ہی کی شاعری چاہتا ہے، لیکن ہمارے ناقدین نے ابتک ان کو سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے نہ ان کو پڑھنے کی۔ آپ نے یہ بڑا کام کیا کہ ان کی شاعری پر مبسوط تبصرہ لکھکر ادب کا ایک

حق ادا کر دیا ہے

آپ کا اداریہ بھی اہم ہے لیکن اس کے بعض خیالات سے مجھے اختلاف ہے اس لئے کہ جہاں آپ نے
ادیبوں کی غیر ذمہ داری بے مائیگی اور لاپروائی پر زور دیا ہے وہاں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ آپ
پرانے نقادوں کا ساتھ دے رہے ہیں، جن کو مخدوم فیض مجاز مجروح، کرشن چندر، بیدی
عصمت وغیرہ سے آگے ادب میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ہم کو اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا
چاہئے، ہم کو مطلقاً یہ زیب نہیں دیتا کہ ہم خود پرستی کے ہاتھوں بزعم خود غلط بن جائیں مگر بھائی
ن بھی کیا خاکساری کہ ہم کچھ ہیں ہی نہیں ـــ جہاں تک انفرادی غور و فکر مطالعے اور فنی
ضت کا تعلق ہے، مجھے یہ کہنے میں مطلقاً کوئی باک نہیں کہ ہم میں سے بہت سے اپنی پچھلی
ں کے ادیبوں سے زیادہ ذمہ دار ہیں اور زیادہ سنجیدگی سے پڑھتے اور اپنے اور غیروں کے
ل و رجحانات اور تحریکوں کو سمجھنے کی ایماندارانہ و غیر جانبدارانہ کوشش کر رہے ہیں، فن پر بھی
نت کرتے ہیں اور ادب کے مقاصد و مطالبات کے ساتھ بھی مخلص رہتے ہیں، اگر اسی کا نام
ذمہ داری اور آزادی کی سچی لگن ہے تو پھر ٹھیک ہے ـــ یہ صرف آپ کی ایک بات
اختلاف ہے اور محض دوستانہ و مخلصانہ اختلاف جہاں تک نئے ادب اور اس کے تقاضوں
سمجھنے اور ان کو پورا کرنے کا سوال ہے آپ بڑی حد تک اپنے ادارتی مضمون میں کامیاب ہیں
ں نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے کہ آپ کے رسالہ کا ایک انفرادی کردار بن رہا ہے اور یہ بڑی چیز ہے
ں دور میں جبکہ ادیبوں اور ان کی تخلیقات میں انفرادی کردار کی جگہ نام نہاد اجتماعی کردار
بڑھتا جا رہا ہے دو تین رسالے تو ایسے ہوں جو اپنے فکری اور نظریاتی رجحان کی
فرادیت کے ساتھ ادیبوں کی انفرادیت کے حق کا بھی تحفظ کریں

وحید اختر

Join eBooks Telegram

سے نہیں ہے کیونکہ ان کے تصورات کا رشتہ تو صرف ماضی اور مردہ ماضی سے ہے زندہ حال اور مستقبل سے
یہ لوگ کٹ چکے ہیں، ہم کو ایسے تہذیبی ورثے کو کھوجنے اور اس کی جاندار اقدار کو اپنانا ہے، جو ہماری فکر و نظ
کو نئی توانائی بخشیں، اس طرف سے اعلیٰ کا چونکا دینے والا تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے خواجہ میر درد
کے نظریات تصوف پر تحقیق کرنے کیلئے قدم اٹھایا، اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ درد جنکی عظیم شاعرانہ شخصیت
سے شاید ہی کوئی ناواقف ہو، اب تک ہماری نظروں میں اس واقفیت کے باوجود اجنبی سے رہے ہیں، اس لئے
کہ ہم نے ان کے اس نظری اور فکری اجتہاد کے کارنامے کو پڑھنے اور اس سے واقف ہونے کی زحمت ہی نہیں
کی جو انھوں نے اپنے عہد کے روحانی اور متصوفانہ تقاضوں کے نتیجے کے طور پر اپنے عہد اور اپنے بعد آنے والی نسلوں
کیلئے چھوڑا ہے۔ درد کے اس متصوفانہ ورثے کی موجودہ زندگی میں کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو مگر اس بات سے واقفیت
خود بڑی ضرورت ہے کہ ہمارے اسلاف اس کلچر کی تعمیر و تشکیل کیلئے، جس کے ہم آج صرف نام لیوا ہیں کیا کچھ
چھوڑ گئے ہیں، ان کی فکر و نظر نہ صرف اپنے عہد کے تمام مروجہ علوم، روحانی اور مادی تجربوں کا احاطہ کر
کرتی بلکہ اپنے عہد کے زندہ تقاضوں سے بھی انصاف کرتی تھی — اس حقیقت سے شاید اردو کے
اساتذہ اور پروفیسروں کی بھی بڑی اکثریت ناواقف ہے، درد ہی پر کیا موقوف ہے ایسے پتہ نہیں اور کتنے
علمی، فکری ذخیرے ہیں جو اب تک کتب خانوں کی الماریوں میں دوسری کتابوں کے منوں بوجھ تلے دبے
ہماری نظروں کو ڈھونڈ رہے ہیں

ہم کو ماضی کے ورثے سے تحقیق کے ذریعے ہی مواد حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اپنی ان زندہ روایتوں
عرفان حاصل کر کے انھیں اپنانا اور اپنا مزاج بھی بنانا ہے جو مغرب کی روایات، یونان و روم کی تاریخ
داستانوں اور دیو مالاؤں سے کم اہم اور شاندار نہیں، طلسم ہوشربا، الف لیلہ، مہابھارت، رامائن، و
پنج تنتر، قرآن، گیتا، احادیث، اسلامی تاریخ، ہندستانی تاریخ، بدھ مت، جین مت، کبیر اور نانک
روایات، صوفیا اور بھگتوں کے نظریات، بذات خود اتنے جاندار ہیں، ہمارے کلچر میں رچے بسے ہیں، ہم جس
کلچر میں آج جی رہے ہیں، وہ ان تمام عناصر کے رچاؤ اور بساؤ سے خالی محض ایک بے روح لباس ہے، جس کی اد
کبھی اتنی ہی کھوکھلی اور بے جان ہیں — میں نے جب کبھی ادبی رسائل میں ایسی نظمیں اور افسانے پڑھے
جن میں یونانی، رومی اساطیر، شکسپیر اور دیگر مغربی مصنفین کے شہکاروں کے کرداروں، روایتوں اور
نظریات، علامت بنا کر ادبی جامہ پہنایا گیا ہے تو ایک طرف مجھے اس ذہنی بے مائگی کا خیال آیا جو اپنے تہذیبی

Join eBooks Telegram

روایات پر بدیسی ورثے اور روایات کو ترجیح دیتی ہے، دوسری طرف اس عرفان سے بیخبری کا احساس ہو
ب کی علامتیں، استعارے اور تشبیہیں کلچر کا جز ہوتی ہیں، جو علامتیں کسی کلچر کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں
جاندار آرٹ پیدا نہیں کر سکتیں، اس میں شک نہیں کہ ہم کو سارے دنیا کی تہذیب، آرٹ، علم، اور
سفے سے ناتا جوڑنا چاہیئے، مگر یہ ناتا مصنوعی نہ ہو بلکہ ہمارے مزاج اور روایتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر
ن کا جز بن جائے، اس کے بغیر بڑا ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔

ان تقاضوں، مسائل اور رجحانات کے پیش نظر آج کی نئی نسل جو ادب پیش کر رہی ہے یا آگے چل کر
تخلیق کرے گی، وہ سیاسی اصطلاح کے معنوں میں ترقی پسند نہ ہوگا، اور رجعت پسند تو اس لئے نہیں
ہو سکتا کہ آرٹ کبھی رجعت پسند نہیں ہوتا صرف معمولی اور عظیم ہوتا ہے، اس لئے وہ ادب صرف ادب
ہوگا۔ غالب اور اقبال کے بعد آج کا عہد اپنے اس مزاج شناس کے انتظار میں ہے جو اسکی نمائندگی کرتے
ہوئے "عظیم ادب" پیدا کرے۔

بقیہ
فکر نو کا آغاز (۲)

یہ سہارا دے سکتے ہیں کہ اور ان کے دل میں یہ یقین پیدا کر سکتے ہیں کہ حالات کے ناسازگار ہونے کے باوجود اس
دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو جانے دیا جائیگا، اس کو ہم اپنی قوت عمل سے، محبت سے، خلوص سے، رجائیت سے
جذبۂ تعمیر سے بچا لیں گے، شرط یہی ہے کہ ہم اپنے ذاتی مفادات کو سماج کے مفادات کے تابع سمجھیں اور
آزادی کے ساتھ ذمہ داریوں کا بھی پورا احساس رکھیں، ذمہ داری کے احساس کے بغیر آزادی صرف
بے راہ روی بن جاتی ہے اور تعمیری صلاحیتیں کھو دیتی ہے

Join eBooks Telegram

نقش کراچی

سرورق: صادقین
قیمت: چار روپے آٹھ آنے

ہر ماہ اردو کے معیاری رسائل سے

انتخاب پیش کرتا ہے، اور اس مرتبہ ایک ضخیم افسانہ نمبر مارچ ۱۹۶۰ء میں پیش کرتا ہے
جس میں ۱۹۵۸ء کے منتخب افسانے شامل ہیں چند لکھنے والے

کرشن چندر — علی عباس حسینی — ابوالفضل صدیقی — قرۃ العین حیدر
شوکت صدیقی — دیوندر ستیارتھی — ہاجرہ مسرور — انتظار حسین
خدیجہ مستور — اشفاق احمد — ممتاز شیریں — قدرت اللہ شہاب
انور — جیلانی بانو — اے حمید — ممتاز مفتی
غلام علی چودھری — واجدہ تبسم — ابوسعید قریشی — حمید کاشمیری
ابن انشا — رام لال — ابن سعید — مخمور جالندھری
غلام الثقلین نقوی — جمیلہ ہاشمی — شرون کمار ورما — انور عنایت اللہ
سید قاسم محمود — انور سجاد — سلطان جمیل نسیم — یونس احمد
صلاح الدین اکبر — سلیم تمنائی — احمد سعدی — اور دوسرے

کاشانۂ اردو بکس کراچی